کرشن چندر
ہم وحشی ہیں

کرشن چندر

نام کتاب : ہم وحشی ہیں
مصنف : کرشن چندر
ناشر : رتیکا چوپڑا
طباعت : فوٹو آفسیٹ پرنٹرس دہلی
اشاعت : سنہ ۲۰۰۲ء
قیمت : 140/=

ایشیا پبلیشر

اے ۳۶ - پلاٹ نمبر ۲/۲۷ - سیکٹر ۹ چیتک اپارٹمنٹس
روہنی - نئی دہلی ۸۵

Hum Vahshi Hain by Krishan Chander
(Collection of Short Stories)

ISBN : 81-86849-22-X

Asia Publishers
A-36 Chetak Appt.
Sector-9, Rohini
Delhi-110085
Ph. : 7561823

فہرست

اپنی بات

میں کتاب پشاور ایکسپریس جو لاہور پاکستان میں شائع ہوئی پڑھ رہا تھا۔ یہ کتاب ہندوستان میں "ہم وحشی ہیں" کے نام سے ۱۹۴۷ء میں شائع ہوئی تھی۔ یہ کتاب کتب پبلیشرز بمبئی نے سب سے پہلے شائع کی تھی۔ معلوم نہیں اب اس کتاب کا نام "ہم وحشی ہیں" سے پشاور ایکسپریس کے نام سے کیوں پاکستان میں شائع کی گئی۔ اس کتاب میں بھی وہی سات کہانیاں ہیں جو "ہم وحشی ہیں" میں تھیں اور اس کتاب میں ایک نیا دیباچہ شامل کیا گیا ہے۔ نیا دیباچہ افضل توصیف نے لکھا ہے۔ وہ لکھتی ہیں۔

"وہ آزادی کا سال تھا جب پنجاب نے اپنے بچے قتل کئے، اپنی عزت برباد کی اور گھر جلائے تب کرشن چندر نے لکھا "ہم وحشی ہیں" امرتا پریتم نے چیخ ماری تو سردار جعفری نے دلاسا دیا کہ مستقبل میں ازالہ ہو جائے گا۔ کیوں کہ مستقبل انقلاب لائے گا مگر ایسا کچھ نہیں ہوا اور زخم ابھی تک ہرے ہیں۔ پنجاب کا کردار آزادی کے سال میں بہت کمزور رہا۔"

مجھے خوشی ہے کہ پاکستان کے عوام سوچتے ہیں کہ جو آزادی کے سال میں ہوا تھا غلط ہوا تھا۔ اس کتاب میں کرشن چندر کی تین اور کہانیاں شامل کی گئی ہیں جو اسی موضوع پر ہیں۔

اوپندر ناتھ

گروی کا موسم اور کہانی داتا

عظیم فنکار تم نے کہانیاں لکھیں۔ بڑی چھوٹی اور بہت اچھی۔ تمہاری کہانیاں لڑکیوں کے لئے ہیں۔ کئی جھانجروں اور پازیبوں کے لئے کچھ سیبوں اور خوبانیوں کے شگوفوں کے لئے ہیں۔ کچھ بادلوں مچھلیوں اور ندیوں کے لئے۔ کھیتوں کا جوبن آم کے بور کی خوشبو۔ کوئل کی کو اور پپیہے کی پی کے لئے بھی بہت سی کہانیاں تمہاری تخلیق ہیں۔ تم نے سفر کئے ضرورت کے سیرو تفریح کے سفر اور زندگی کے سفر۔ ہر جگہ جہاں تم گئے کہانیوں نے تمہارا استقبال کیا۔ کشمیر پنجاب بمبئی کیرالہ پانڈی چری۔ ہر جگہ سے کہانیاں تمہارے ساتھ چل پڑیں۔ پھر تم نے انہیں لکھ ڈالا۔ سبھی کو بہت پریت سے تم نے اپنی کسی کہانی کو مایوس نہیں کیا۔ تمہاری سبھی کہانیاں دل نشین ہیں اور دلگیر بھی۔ مگر میں کہوں گی تمہاری سب سے اونچی کہانیاں وہ ہیں جو تم نے آدم ہوا اور شیطان کے کردار پہ لکھیں۔ آدم حوا جو دنیا میں آ کے مرد عورت کا روپ دھار گئے اور شیطان جس نے آدم خور سے لے کر ولن اور سامراج تک کی شکلیں اختیار کر لیں۔ دنیا کی ساری تاریخ ان کے کرداروں سے جڑی ہوئی اور دنیا کی ساری تاریخ ایک اور تثلیث سے جڑی ہوئی ہے روٹی کپڑا اور مکان۔ ان تینوں چیزوں کے نہ ہونے سے انسانی کنبے کا بنیادی یونٹ' ماں باپ اور بچہ' برباد ہو جاتا ہے۔ ان کی تہذیب کا خاتمہ بھی ہو جاتا ہے اور تاریخ ایڑیاں رگڑنے لگتی ہے۔ یہ تینوں اشیا ضروری ہیں۔ اسی ترتیب سے۔ روٹی کپڑا مکان۔

روٹی وہ ہے کہ جس کے نہ ہونے سے بچہ بھوکوں مر جاتا ہے۔ کپڑا وہ ہے جس

کب آئے گا وہ دن جب چاول چور پکڑ لئے جائیں گے؟ کمائی کر کے ڈھیر لگانے والوں کے پیٹ آنکھیں اور گھر آخر میں خالی نہیں رہ جایا کریں گے۔ جھانجر گاتی رہے گی۔ سب ناچتے رہیں گے۔ تمہاری کہانی نئے خواب دیکھنے لگتی ہے۔ یہ ساری باتیں ان دنوں کی ہیں جب وہ چاول تمہارے بھی تھے اور تمہاری ماں جی کے میکے کی سب سے اچھی سوغات میں شامل تھے۔ تب تمہاری کہانی کی ساری محبتیں اور خواب اسی زمین پر جاگتے تھے۔ جس پر راوی اور چناب بہتی ہیں۔

ایک یگ بیت گیا۔ بہت کچھ بدل کر بھی کچھ نہیں بدلا۔ ہماری ٹوٹ پھوٹ ہو چکی مگر ہمارے لئے بنا کچھ بھی نہیں۔ پھر بھی وقت گزر گیا ہے۔ ہمارے سروں پر برف بکھیرتا ہوا وقت نکل گیا ہے۔ وہ پرانی نسلوں کے چاول تھے جو مہک جاتے تو تم کہانی لکھتے نیلام ہوتے تو کہانی لکھتے۔ محبت اور نفرت خواب اور خیال ہر کہانی کے انگ ساک ہوتے ہیں مگر ٹوٹ پھوٹ کے وقتوں میں خود کہانی بھی ٹوٹ پھوٹ جاتی ہے۔ اس کے اجزا بھی بکھر جاتے ہیں جیسے کہ آج ہو رہا ہے۔ آج جبکہ ہجر کے بہت سے سال پورے کر لینے کے بعد تم نے اپنی کہانی مکمل کر لی۔ آج یہاں تمہارے دیس میں کہانی کے پاؤں میں ہزاروں کانٹے ہیں۔ اس کے خواب ٹوٹ چکے ہیں۔ خواب ٹوٹ جانے کے بعد کا موسم ایسا ہی ہوتا ہے کہ کہانی کو زہریلا نشہ چڑھ جاتا ہے۔ وقت بے وقت سونے لگتی ہے۔ سوئی ہوئی کہانی کو انہوں نے زنجیروں میں کس کر کالے سمندر میں ڈال دیا اور بے فکری سے سارے چاول گروی رکھ دیئے۔ سارے نئے چاول جن سے گھر کی کوٹھڑیاں بھر لینے کا خواب ابھی پورا نہیں ہوا تھا۔ گروی ڈال دیئے گئے۔ کھیت جوان ہونے سے پہلے ہی خوشبو کی نیلامی لگ چکی۔ یہ اس زمین پر ہوا جہاں تمہاری پہلی محبت جاگی تھی اور پہلی کہانی لکھی گئی تھی یہ سب کچھ کیوں ہوا؟ اتنے بدصورت طریقے سے کیوں کر ہوا؟ اس کی بھی ایک کہانی تھی جو لکھی نہیں گئی کون لکھتا وہ کہانی؟

تمہارے دیس نکالے کے بعد یہاں وہ اندھیرے گہرے ہو گئے جن کی اوٹ میں چوروں کی چاندی ہوتی ہے اور ڈاکوؤں کا تو سونا بھی ہوتا ہے۔ سو تمہارے بعد یہاں

باہر والوں کا سونا چاندی بہت ہوا۔ مگر گھر والوں کی پلاؤ زردے کی تہذیب کو زوال آ گیا۔ بالکل اسی طرح ہوا جیسے ہیر کے بعد چوری کٹوری اور لسی چھنے کی تہذیب کو زوال آ گیا تھا۔ وارث شاہ کے پنجاب کے بعد کرشن چندر کا پنجاب بھی لٹ گیا۔ ہیر روئی تو وارث شاہ نے بین لکھ لکھ مارے، راج کنول اور سروری کے گھروں میں آگ لگی تو امرتا کرلاتی رہی اور کرشن چندر نے کہانیوں کے ڈھیر لگا دیئے۔ یہ کہانیاں تہذیب کے اجڑ جانے کی اور محبتوں کے برباد ہونے کی تاریخ رہیں گی۔ تاریخ تو وہ کہانیاں بھی رہیں گی جو محبتوں اور چاول چوروں کے قصے بیان کرتی ہیں۔ مگر اصل بات تو نئے چاولوں کی ہے جو گروی ڈال دیئے گئے ہیں اور جن کی کہانی لکھنے والا کرشن جیسا کوئی پیدا ہوا نہیں۔

ہاں انہوں نے گروی رکھ دیئے۔

وہ چاول جو کھیت سے کاٹے نہیں گئے۔ وہ چاول جن کا دانہ ابھی کچا ہے۔

وہ چاول جن کے کھانے والے منہ ابھی کھلے نہیں

وہ چاول جن کو کھانے والے منہ ابھی کھلے نہیں

اور وہ چاول بھی جنہیں بونے والے ہاتھ ابھی ماں کے پیٹ سے نکلے نہیں۔

کئی فصلوں کے چاول کئی نسلوں کا مستقبل کئی موسموں کی محبت اور ایک پوری تہذیب کی خوشبو آج گروی ڈال دی گئی ہے۔ مگر یہ صرف یہیں پر نہیں ہوا۔ جہاں جہاں انسان کمزور ہوا وہیں وہیں ڈاکے پڑے اور ایسی نیلامیوں کے بازار لگے ہیں۔ تمہیں تو معلوم ہی ہے انقلاب لانے والی مضبوط تیسری دنیا کے اندر ایک کمزور چوتھی دنیا بسی ہوتی ہے اس چوتھی دنیا کے اندر آدم خوروں کی تعداد اور طاقت آج اتنی بڑھ گئی ہے کہ انہوں نے چاول لوٹنے کے علاوہ چلتے پھرتے انسانوں کے جسم چھیلنے شروع کر دیئے ہیں۔ زندہ ہڈیوں سے گودا کھینچ لینے کی مشینیں لگا دی ہیں۔ تم نے تو پرانی نسل کے چوروں کا ماتم کیا تھا۔ وہ جو اتنے ظالم تھے کہ کھیت سے کھلیان سے۔ ماں کی ہانڈی سے بچے کی تھالی سے چرا کر چاول منڈی لے جاتے گاؤں کے چاول شہر کی منڈی میں جہاں دلال ہوتا ہے۔ ڈاکو کی کوٹھیاں ہوتی ہیں اور داشتائیں سڑکیں اور

کے نہ ہونے سے آدمی کے جسم کو شرمسار ہونا پڑتا ہے اور مکان وہ ہے جس کے نہ ہونے سے اماں حوا جنت میں اداس ہو جاتی ہے اور دنیا میں عورت خوف سے مر جاتی ہے۔ یوں بھی ان تینوں چیزوں کے بغیر چوتھی چیز یعنی تہذیب آدم کا جنم نہیں ہوتا۔ بھوکے پیٹ، ننگے بدن اور بغیر چھت کے سر لے کر کوئی تصویریں بنا سکتا ہے نہ کہانی سوچ سکتا ہے۔ کچھ ایجاد بھی نہیں کر سکتا۔ ہر جگہ انسان نے روٹی پہلے تلاش کی چراغ بعد میں بنایا۔ روٹی کپڑا اور مکان انسان کی سیاست بھی ہے ثقافت بھی۔ سائنس بھی اور گیان بھی۔

مگر تمہاری کئی کہانیاں تو چاولوں کے بارے میں بھی ہیں۔ چاول شاید زندگی کے چوتھے شلف پر سجائے جانے والی شے ہو سکتی ہے۔ مگر اس بات کے لئے فساد کا امکان بہت ہے کوئی بنگلہ دیشی عورت یہ بات سن لے تو ایک پنجابن کے لئے اس کا پرانا غصہ پھر سے چمک اٹھے۔ ویسے مجھے اطلاع بھی نہیں۔ جنت والے آدم کے قصے میں بنگال والوں کی کہانیاں گندم کے دانے کو کونسی حیثیت دیتی ہیں۔ تاہم تمہاری کہانیوں میں چاولوں کو ٹھیک درجے کی قدر دی گئی ہے۔ ایک چاول وہ ہوتے ہیں جن کے نہ ہونے سے بنگال مر جاتا ہے۔ دوسرے چاول وہ ہوتے ہیں جن کے نہ ہونے سے کشمیر کی خوشبو پھیکی پڑ جاتی ہے اور تیسری قسم چاولوں کی ایسی ہے کہ جس کے نہ ہونے سے پنجاب کی تہذیب کو فاقے آنے لگتے ہیں۔ ہمارے گھروں میں پلاؤ زردہ پکے تو خوشحالی کا گمان ہوتا ہے اور متمدن ہونے کا بھی صرف دال روٹی سے ہم اپنا پیٹ بھر لیتے ہیں۔ لیکن اگر یہی دال روٹی مہمان کے آگے رکھ دیں تو مفلس ہوتے ہیں یا کنجوس۔ یعنی دل کے غریب یا پھر ان میں سے جنہوں نے سفید چٹے چاولوں کی تھالی پروس کر اوپر سے تھی شکر کی سنہری مینا کاری کر کے دستر خوان پہ سجانے کی تہذیب اپنے اجداد سے سیکھی نہیں۔

یہ کہانیاں تمہاری اس دور کی کہانیاں ہیں۔ جب تم یہیں پہ یعنی اپنے اہل وطن والی زمین پہ بستے تھے۔ اس وقت بھی تم اتنے ہی ترقی پسند تھے اور چاول بونے اور چاول کھانے والوں کے درمیان کھیلا کرنے والے اس ہاتھ کو تلاش کرتے رہتے جو

پکے پکائے چاول کھلیان سے سمیٹ کر منڈی پہنچا دیتا ہے اور سونے کے سکے اپنی جیب میں بھر لیتا ہے پھر ایسے ہی کئی ہاتھوں کی ملی بھگت سے یہ دیس تم سے چھٹ گیا تو تم سارے ہندوستان کی اور ساری دنیا کی کہانیاں لکھنے لگے۔ مگر اپنی جنم بھومی کے چاول کبھی تمہیں بھول نہیں سکے۔ جو یہاں بہت سارے بہت اجلے بہت چمکیلے اور بہت خوشبو دار ہوتے ہیں۔ ان کا پلاؤ پکتا ہے اور زردہ جس میں ڈالی جانے والی زعفران تمہارے اپنے کشمیر سے آتی تھی۔ سو پلاؤ زردے اور زعفران کی تہذیب سے تمہارا ناطہ جب ٹوٹا تو بھی تم نے کہانی لکھنا نہیں چھوڑا۔ مگر کسی اور تہذیب کو اپنا نہیں کہا۔ کسی گلی کو اپنے گھر کی گلی نہیں بنایا ہاں' مگر یادوں کی تہذیب سے اپنا رشتہ پکا رکھا۔ بس پھر کیا تھا۔ تم کہانی کے بنجارے ایک بار گھر سے نکل گئے تو قلم کاغذ لے کر جہاں تہاں گھومتے پھرے شہر' شہر' بستی' بستی' دلی' بمبئی' کلکتہ' پانڈی چیری۔ ہندوستان کے آخری کنارے تک تم بھاگے۔ مگر پہلی یادوں کا جھولا تمہارے کندھے پہ جھولتا ہی رہا اور کہیں باسمتی کی خوشبو کو پیچھے نہ چھوڑ سکے تم نے اعتراف کیا کہ صندل کے جنگل میں الائچی کے باغ میں کاجو کے ڈھیر پہ اور ناریل کے دودھ میں ہر ایک مہک تمہیں یاد دلاتی رہی کہ چاول کے کھیت جوان ہوں تو خوشبو کی ٹمیاریں پنجاب کی دھرتی پر ایک البیلا ناچ ناچتی ہیں۔ جانے کتی بار تم نے میٹھے موسموں کی ان بانکی رتوں کو یاد کیا۔ جب پانی مٹی کے ملاپ کی خوشبو سمٹ کر باسمتی کے گچھوں میں بھر جاتی ہے۔ پھر یہ گچھے کھل کر موتیوں کے ڈھیر بن جاتے ہیں اور یہ بھی کہ اکثر یہ موتی کھلیانوں سے چوری ہو جاتے۔ موتی رولنے والے کے ہاتھ پیٹ اور آنکھیں خالی رہ جاتی ہیں۔ تب کیا ہوتا ہے تمہاری کہانی میں چھنکتی جھانجر کی چھنک اچانک گونگی ہو جاتی ہے۔ رومان بکھر جاتا ہے۔ پیار سے شروع ہونے والا ہر قصہ آگے جا کر دکھ سے بوجھل ہو جاتا ہے۔ پھر تمہارے کہانی کار کو یہ محسوس ہوتا ہے جیسے چاول نہیں لوگوں کے ہاتھ پیٹ اور بچے چرا لئے گئے۔ پنجاب کی تہذیب بیچ ڈالی گئی ہے۔ مہمان کے آگے سے پلاؤ زردے کی تھال اٹھا کر نیلام پہ چڑھا دی گئی ہے اور وہ چاندی کی جھانجریں گروی ڈال دی گئیں ہیں جنہیں پہن کر نند بھابی کو بیساکھی ناچنا تھی۔

کاریں۔ اور ہاں جہاں چیف کالج بھی ہوتا ہے۔ جس میں چوروں اور ڈاکوؤں کے بچے طرے والی پگڑیاں باندھ کر پنجاب کی تہذیب کا نام اونچا کرتے ہیں۔ دوسری طرف یہی میٹھے انگریزی بولنے والے جیکی سے گھڑسواری سیکھ کر ترقی یافتہ دنیا کے شہزادوں سے رشتہ بھی جوڑتے ہیں۔ کھیت سے منڈی تک کے درمیان کتنا کچھ اور بھی آتا ہے۔ گاؤں سے شہر تک کسان سے سیٹھ تک دولت کی پائپ لائن چلتی ہے۔ کیوں چلتی ہے کس طرح چلتی ہے؟ یہ سوال تمہاری کہانیاں اٹھاتی ہیں اور سمجھاتی بھی ہیں۔ مگر آخر میں تمہاری ہر ایک کہانی انتظار کی وادیوں میں اتر جاتی ہے۔ اس کے لالہ زاروں میں میں ایک نئے سورج کے طلوع کا ایک نو یکلے موسم کا رستہ دیکھتی ہے۔ ایک شاندار سند۔۔ وقت کا تمہاری کہانی کے آنچل سے بندھا ملتا ہے۔ جب تمام ایسی پائپ لائنیں توڑ ڈالی جائیں گی جو دولت کھینچ کر لے جاتی ہیں۔ گاؤں سے شہر تک کسان سے سیٹھ تک مٹی کے گھر سے پتھر کے محل تک اور پھر وہ رت سدا جاگتی رہے گی جب ہر شام ماں کی رسوائی میں زردے کی دیگچی اترے گی۔ ہر تہوار پہ نمیار کے پاؤں میں جھانجر بجے گی اور کماؤ گبھرو کی چھاتی چوڑی ہو گی۔

یہ سب کہانیاں پڑھتے ہوئے مجھے سوچنا پڑتا ہے اور پوچھنا بھی۔ کیا یہ وہی کہانیاں ہیں جنہیں غلامی کے زمانے میں لکھا گیا اور تیسری دنیا کے ایک لکھاری نے چوتھی دنیا کے لئے یہ سب کچھ لکھا تب کہانی لکھنے والوں کے لئے قید کوڑے کا قانون لاگو کیوں نہیں تھا؟ آج تو ہر کہانی کی پیٹھ پر ٹکٹکی بندھی ہے اور کندھوں پر صلیب کا بوجھ لدا ہے کہانی ہی کیوں۔ ہر تصویر جو سچے رنگوں سے بنی اس کی پشت پر دس کوڑے زہریلے سانپوں کی طرح لہراتے ہیں۔ بلکہ آج تو کہانی کو گروی ڈالنے کا بھی دستور بن چکا ہے۔ ڈاکے کی تہذیب ترقی پر ہے۔ دولت کھینچنے والی پائپ لائن پہلے سے بہت موٹی اور لمبی ہو گئی ہے مگر کھیتوں کی پیداوار گھٹتی جا رہی ہے۔ زمین کی جڑوں کو دیمک چاٹ رہی ہے۔ ڈاکے کی تہذیب نے کئی موزی پال رکھے ہیں۔ اب تو ڈاکو تہذیب کا بھبھوکیڑا سارے جسم پہ کانٹے سجائے گلیوں بازاروں میں گھوم رہا ہے لوگ اس کی بو دور سے سونگھ لیتے ہیں اور پیلے زرد ہو جاتے ہیں۔ گروی پڑے کھیت کون چھڑائے؟

گروی کا نظام بھی پیچیدہ بنا دیا گیا ہے۔ ساہوکار بیرون ملک بیٹھا ہے دلال ملک کے اندر رہتا ہے اور منڈی کبھی سرحد پار کبھی سمندر پار۔ دلال چلنے بدلتا ہے۔ تمہارے دنوں میں زیادہ تر دھوتی کرتے والا ہی دلال ہوتا تھا۔ درمیان میں اچکن ٹوپی اور شلوار کرتا چلتا رہا۔ آخر وردی بوٹ اس کے قومی لباس کے نمائشی اجزا ہوتے ہیں۔ کھادی کی صفات شرعی داڑھی میں شرعی داڑھی کی خصوصیات فوجی بوٹوں سے ابھرتی چلی گئی ہیں۔ بس اتنا ہی ارتقاء ہے جو ہمارے معاشرے کو آزادی کے بعد نصیب ہو سکا۔

کہانی کا سلسلہ تو وہیں کہیں اٹکا ہوا ہے۔ جہاں تم چھوڑ گئے تھے۔ کتنے برس بیت چکے چاولوں کی فصلیں جوان ہونے سے پہلے اور انسان کی نسلیں پیدا ہونے سے پہلے ہی گروی ڈالنے کا موسم آجاتا ہے۔ دولت کھینچنے والی پائپ لائن اب دوہری ہے۔ زمین کے اوپر اور زمین کے نیچے بیچنے خریدنے کا کام انڈر گراؤنڈ بھی ہوتا ہیں۔ مگر ہمیں خبر مل ہی جاتی ہے۔ یہ بیسویں صدی کی آخری چوتھائی ہے نا۔ اب قرقیاں کرنے والے کو سات سمندر پار سے آکر یہاں کوٹھی کھولنے اور چھاؤنی بنانے کی ضرورت نہیں پڑتی مگر خبریں سات سمندر پار سے پل بھر میں آجاتی ہیں۔ ساہوکار جس کے کھاتے میں اناج اور انسان کی جنس گروی پڑتی ہے ایک آدمی یا کئی آدمی نہیں ہوتے۔بلکہ آدمی سرے سے ہوتے ہی نہیں۔ وہ تو ملٹی نیشن کمپنی ہوتی ہے۔ جس کی پبلسٹی بھی ملٹی نیشن اداروں کے ذریعے کرائی جاتی ہے۔ اور ہم لوگ جن کے بچے اور چاول گروی پڑتے ہیں۔ ہمیں فقط چپ رہنا ہوتا ہے اور اگر کبھی ہم چپ رہنے کے آداب سے پہلوتہی کر جائیں تو ہمارا نام تخریب کار ہو جاتا ہے تخریب کار کی سزا بہت کڑی ہوتی ہے۔ کچھ اسی طرح کی جس طرح ایسٹ انڈیا کمپنی کبھی دیتی تھی نہیں وہ ون نیشن کمپنی تھی۔ سارے برصغیر کی اجارہ دار اس کی اجارہ داری اب ملٹی نیشن اجارہ داریوں میں بدل گئی ہے۔ چھوٹی دنیا کے اکثر حکمران ایسی اجارہ داریوں کے لئے دلالی کا کام کرتے ہیں۔ کوئی اگر نہیں کرنا چاہتا تو اس کا تختہ الٹنے اور پھانسی دلوانے کا کام کرنے والے ادارے بھی وجود رکھتے ہیں۔ جو بغاوتیں کروانے ار تحریکیں

چلوانے تک کی صلاحیت اور قوت سے مالا مال رکھے جاتے ہیں۔ یہ سلسلے لمبے ہیں اور چلتے ہیں مگر ہم جن کے بچے اور چاول گروی پڑتے ہیں۔ انھیں فقط چپ رہ کر سب کچھ دیکھنا اور سہنا ہوتا ہے۔ یا ایسٹ انڈیا کمپنی کے دور کی تاریخ پڑھنی ہوتی ہے۔ پھر اس کے آگے تاریخ کے سبق پھانسی کوڑے وغیرہ اپنے بدن پر لکھنے ہوتے ہیں۔ بس اتنا ہی کردار ہے ہمارا۔

نئے سامراج کی غلامی جس کے نتیجے دنیا کے غلام بنے ہیں اور تم نے وقت کے عظیم کہانی کار نے نئے غلاموں کی کہانیاں بھی لکھی ہیں۔ یہ غلامی کی جدید تر ظالم تر اور مشکل تر و بڑی گنجل دار حالت ہے۔ ویسے ہمیں ساری باتوں کی خبر رہتی ہے کیونکہ نئے غلام بھی بہت ہوشیار ہو گئے ہیں اور نئے غلاموں کا کہانی کار دانشور سبھی کچھ جانتا ہے۔ یہ بھی کہ غلامی غلاموں کو چپ رکھنے کی تربیت پر بھی اجارہ داریاں ہیں اور وہ بھی کسی نہ کسی ملٹی نیشن کمپنی کے ہاتھ میں ہوتی ہیں۔ یہ کمپنیاں ملٹی بھی ہیں اور انٹرنیشنل بھی۔ سامراج خود انٹر نیشنل ہو چکا ہے۔ مغرب تا مشرق شمال تا جنوب اس کی عملداریاں ہی وہی ماسٹرپلان بھیجتا ہے۔ وہی دنیا کو تقسیم اور کنٹرول کرتا ہے اور اسی کی بندوق چلتی ہے سپاہی بھیجنے کی اب اسے ضرورت نہیں۔ کمانڈر بھی لوکل مل جاتے ہیں۔ اقتدار کی ٹیبل سے کچھ کھانا دے کر کمانڈر ان چیف بنا لیا جاتا ہے۔ اسلحہ اپنی فیکٹریوں سے تیسری دنیا کی منڈیوں میں ہے اب پہلے سے بھی زیادہ لایا جاتا ہے۔ چاول' پٹ سن' مونگ پھلی' تیل اور تانبے کی دولت اٹھا کر وہ بندوق بارود کا ڈھیر ہر جگہ لگائے جاتے ہیں۔ چوتھی دنیا اناج پیدا کرتی ہے مگر اناج کی بھوکی ہے۔ اس کا کل خزانہ ان فوجوں پر خرچ ہوتا ہے جو سامراج کے مقاصد کے تحت رکھی گئی ہوتی ہیں۔ نام نہاد قومی فوج کا سپاہی اب پرانا دیسی بھی نہیں رہا جس نے کبھی ایسٹ انڈیا کمپنی پر بندوق تانی تھی۔ ملٹی نیشن سامراج نے ایسی مشین بھی تیار کر لی ہے جو دیسی سپاہی کے اندر سے نیشنل کریکٹر کو کھینچ کر فقط بندوق وردی کا پتلا بنا کر چھوڑ دیتی ہے۔ یہ بڑی دور رس ٹیکنیک ہے۔ اس کے بعد سپاہی اس کا بندہ ہو جاتا ہے۔ جس نے بندوق دی ہو۔ اس کا نہیں رہتا جس نے جنم دیا ہو۔ بلکہ جنم دینے والوں کو دشمن

گرواتا ہے۔ ان پہ پہرے لگاتا ہے۔ چڑھائی کرتا ہے اور گرفتار کر کے ٹرائل بھی کرتا ہے۔ اس سپاہی کا کمانڈر بھی ویسی ہوتا ہے۔ مگر سامراج کے ادارے ایسے کمانڈروں پر بڑی گہری تکنیک سے سرجری کرتے ہیں اسے ملٹی پرپز Multi Purpose بنا لیتا ہے۔ یعنی ایک ہی وقت میں سپہ سالار حاکم اور دلال۔ ان تین گدیوں پر ایک ساتھ بٹھا کر بہت سی بندوقیں بہت سے ڈالر بہت سے مرنجے اور کوٹھیاں اقتدار کے نشے کی بوتلیں اور مفلس عوام اس کے سامنے ڈال دیئے جاتے ہیں۔ اتنا کچھ مل جانے پر بھلا کوئی اندازہ کر سکتا ہے۔ اس کے زور بازو کا یہ سب کچھ چوتھی دنیا کا ایک بڑا حصہ آباد ہے۔ اسی لئے تو ہمارے خوابوں کو گولیاں مارنے کے لئے بندوقیں انہیں رکھنا پڑتی ہیں اور وہ بھی چھ لاکھ سے کم نہیں۔

ہم تمہیں بتائیں کہ اس وقت کہانی کے خواب اور خوابوں کی سبز پری۔ کال کوٹھڑی میں کلفاموں کا قتل "آدم بو آدم بو" آوازیں' خوف کی لہریں ہماری رگوں میں کالا دیو گلیوں میں' بھوک ذلت چاول بونے والے کے لئے اور گندم بونے والوں کے لئے بھی۔ سنا تم نے کہانی کے کرشن کنہیا! کیسی واردات بیت گئی تمہاری ماں کے دیس پر اور ان چاولوں پر جن کے کھانے کی خواہش تمہیں آخر تک رہی۔ وہ چاول جنہیں کھانے کی خواہش تمہیں آخر دن تک رہی۔ وہ چاول جنہیں کھانے کی خواہش تمہیں آخر دن تک رہی۔

وہ چاول جنہیں کھانے کی مجھے خواہش ہے۔

وہ چاول بھی جنہیں کھانے کی بچوں کو خواہش ہے۔

اجلے چمکیلے مہکدار موتی کے دانے گروی ہیں' کھیتوں کا جوبن پلاؤ زردے کی خوشبو' مہمان نوازی کی ریت گروی ہے۔ ہیر کی چنی ر-شماں کی جھانجر رانجھے کی ونجلی ماہیئے کے گیت سب کچھ گروی ڈال کر بارود کی بوریاں اور غسل خانے کے کموڈ منگوا لئے گئے ہیں۔ تم اگر اس وقت یہاں ہوتے ہیں یا تم جیسا کوئی ہوتا تو کس طرح کہانی لکھی جاتی؟ کس نوعیت کا صدمہ تمہاری رچنا کو اٹھانا پڑتا۔ شاید اسی طرح کا جیسے ماں کی چادر اور محبوبہ کی جھانجر گروی رکھنے پر فنکار کا صدمہ ہوتا ہے ویسے اس طرح کا

ایک صدمہ تو تم سہ چکے ہو۔ پنجاب کے فنکار کے حصے کا پورا صدمہ اٹھا کر ہی تم یہاں سے نکلے ہو گے۔ وہ دن جب تم نے پشاور ایکسپریس لکھی۔

اس دن اسی تاریخ کو جب تم جیسے سچے فنکار کو بے وفائی کا الزام دے کر دیس نکالا دیا گیا۔ تمہاری جگہ تو آج تک خالی ہے۔ مگر کچھ مصاحب پیشہ ٹٹ پونجئے۔ کچھ ٹوپیاں شیروانیاں فنکار کے لقب چرا کر یہاں آ بیٹھی ہیں۔ یہ تاریخ کا بہت بڑا مذاق تھا۔

مگر تاریخ کا صدمہ کچھ اور بھی بڑا۔ اس صدمے کے اثر سے بظاہر کچھ نہیں بگڑا۔ چاول بوئے جاتے رہے۔ چاول چوری ہوتے رہے منڈیاں لگتی رہیں۔ وصولیاں کرنے اور بیاج لگانے والی گدیوں پر دھوتی کرتے کی جگہ اچکن ٹوپی سج گئی تو بھی کاروبار پہ فرق نہیں پڑا۔ سود بیاج اسی طرح چلتا رہا اور چمکتا رہا۔ ادیب کہانیاں لکھتا رہا۔ کہانیوں کے مجموعے چھپتے رہے۔ مگر اس کے بعد اس زمین پر کوئی ایسا جنم نہیں ہوا۔ جس کی تخیق کی خوشبو سو سو رنگ کی سوغاتوں کے تھال سر پر سجا کر کشمیر سے راس کماری تک دھمالیں ناچتی چلی جائے مگر اپنے گلے کے تعویض میں بھر کے پنجاب کی مٹی کو سدا سینے لگائے رکھے۔ یہاں بچے جننے والی ماں بچ گئی۔ چاول پیدا کرنے والی ماں بھی بچ گئی۔ مگر فنکار پیدا کرنے والی ماں کی کوکھ صدمہ کھا گئی۔ ویسے یہ بات بھی ذرا پہلے کے زمانے تک ہی ٹھیک تھی۔ اس وقت جب چاول پیدا کرنے والی ماں ہی گروی پڑی تھی۔ اب تو اور بھی بہت کچھ ہو چکا ہے۔ بیٹے بیٹیاں قیدی' رانجھا سولی اور ہیر کھیڑیاں دے وس پے گئی۔ مگر کسی قبر سے وارث شاہ نہیں بولا۔ کسی گلی سے کرشن چندر کی آواز نہیں آئی۔ کسی کو زیادہ حیرت بھی نہیں ہوئی کہ قلم بیچارا تو عمر قید کا قیدی ہے۔ کہانی کا بیج تو اسی دن ٹھٹھر گیا تھا جب فنکار کی جگہ مصاحب کو الاٹ ہوئی۔

ویسے مجھے افسوس نہیں کرشن جی' کہ تمہیں دیس نکالا دیا گیا۔ مجھے خوشی ہے کہ تم ٹھیک وقت پر اور اسی زمین سے نکال دیئے گئے۔ وہ دھرتی جس کا مان لے کر بعد میں دنیا جہاں کی کہانیاں لکھتے پھرے۔ یہ بھی خوشی کی بات ہے کہ بہت دور جا کر بھی

تمہارا پیار اس زمین کے لئے میلا نہیں ہوا۔ پنجاب کے بعد تم نے کسی خطے کو اپنا دیس کہہ کر نہیں پکارا۔ مگر کہانی کے پیار کو بہت سی زمینوں اور دلوں تک پھیل جانے دیا۔ بنگال، مہاراشٹر آندھرا کیرالا تلنگانہ کوریا، چین، جاپان، کمبوڈیا افریقہ، ویت نام، کیوبا، ساری انسانوں کی دنیا۔ جدوجہد کی دنیا، تمہاری دنیا بن گئی، چاول چوروں کی کہانیاں لکھتے لکھتے کپاس کا جو اور مونگ پھلی کے چوروں تک پہنچے۔ باسمتی کی خوشبو کھوجتے کھوجتے صندل الائچی کی مہک اور پھر آگے سفید سرخ گلابوں کی دنیا میں جا نکلے پلاؤ زردے کی تہذیب والی دنیا سے نکال دیئے گئے تو ہندوستان کے آخری کنارے پانڈی چری تک کی تہذیب کے نقش نگار چنتے پھرے۔

کہانی کی دنیا پھیلتی چلی گئی اور کہانی کار کا قلم چاول چوروں کے چالان لکھتے لکھتے تہذ-یبیں اجاڑنے والوں کے مقدمے لکھنے لگا۔ پھر جب اسے مذہب دھرم کی چھاؤں اور سامراج کے نیپام بم کے جہنم زاروں سے گزرنا پڑا تو اس نے انقلاب کا فائر پروف پہن لیا۔ ہاں تبھی تو وہ ان محاذوں تک پہنچ سکا۔ جہاں آدمی اور عورت آدم خوروں کے خلاف مورچہ لگائے اپنے بچوں کی بقاء کے لئے جنگ لڑ رہے تھے اور تمہارا قلم ان فنکاروں سے جا ملا جو چین بولیویا اور ویت نام کے جلتے سمن زاروں میں بندوق کی نالی سے امن کا گیت لکھ رہے تھے۔ تمہارے قلم کی جرات مندی کو آفرین ہو کہ کال کوٹھڑیوں میں گھس کر ان آدم بچوں کے انٹرویو کر لایا جو اپنی پھانسی کی رات بھی اندھیرے کے پندھ سے باہر نکل کر دکھی انسانیت کے لئے خوشی کی صبح کا طلوع دیکھتے رہے تھے۔ ان منزلوں سے گزرتی ہوئی تمہاری کہانی ان کہانیوں سے جا ملی جو جدوجہد اور مزاحمت کے اگلے مورچوں تک جاتی ہیں۔ ساتھیوں کے لئے سرخ پھولوں کے ہار لے کر اور دشمن کے لئے تھری ناٹ تھری کی گولی بن کر۔ مگر سب سے آخری بات یہ ہے کہ کسی جگہ کسی دن اور کسی اعزاز کے بعد بھی اس کہانی نے اپنی جنم بھومی کا پتہ نہیں کھویا۔ ان جگہوں کے نام نہیں بھلائے جن میں اس کا بچپن کھیلا تھا۔ سولہویں سال کے سپنے جاگے تھے اور پہلی محبت کی کلی چٹکی تھی۔ دور تلنگانہ کے شہید رگھو کی کہانی شروع کرنے سے پہلے تم نے پنجاب کے بھگت سنگھ کو پرنام کیا۔ کیرالہ کے

انقلابی کسانوں کی عظیم قربانیوں کو تعظیم دیتے ہوئے جلیاں والا کو سلام بھیجا۔
سو اچھا ہی ہوا۔ کہانی داتا۔ تمہیں تمہارے پیار کی زمین سے جدا کر دیا گیا۔ کہانی تو بچ گئی نا۔ قلم کی آبرو ساری انسانیت کی سانجھ ہے۔ تم نے کہانیاں لکھیں، ہماری عزت میں اضافہ ہوا۔ کرن کرن روشنی ہر جگہ گئی، سلاخوں کے پیچھے سانس لیتی کوٹھڑیوں میں چھپروں کے نیچے سہمی ہوئی جگیوں میں کالے کیچڑ کے اوپر جھکی ہوئی مزدور رکھولیوں میں ایک ایک روزن کھلا امید کا اعتبار کا اور دل سے دل کی Communication کا کرشن چندر پنجاب میں نہیں رہا۔ ساری دنیا میں پھیل گیا۔ مگر پھر بھی اپنی روح کے اندر کی دلگیر اداسی کا مداوا اسے نہ ملا۔ ملتا کیسے انسان پیدا تو ایک ہی بار ہوتا ہے۔ جوان بھی ایک ہی بار ہوتا ہے موت اور بڑھاپے کا انت نہیں۔ مگر مداوا موت میں نہیں نہ انت میں ہے۔
شاید تم اس بات کو سمجھتے بھی تھے اور اس خاص اپنی روح کی بات کو اپنے ہی پاس رکھنا چاہتے تھے۔ اسی لئے کبھی تم نے اپنی جلاوطنی پر الگ سے کہانی نہیں لکھی۔ تمہاری پوتھیوں میں اس صدمے کا ذکر بار بار آتا ہے۔ مگر کہانی کوئی نہیں لکھی آج تو ہم بھی کہہ سکتے ہیں کہ اگر تم بھگانہ دیئے گئے ہوتے تو یہاں رہ کر تمہاری قلم بھی گروی پڑ جاتی وہ خوشبو تک بک جاتی جو ہوا کے کاندھوں پر چڑھ کر سرحدیں پھلانگتی کبھی کبھی ادھر سے ہو کر نکل جاتی ہے۔
اچھا ہی رہا۔ جو تم اسی طرف کو مائیگریٹ کر گئے۔ جہاں سوت کپاس کے بہت سے کارخانے ہیں کھیت سے دولت کھینچ کر فیکٹری لے جانے والی پائپ لائنیں بھی لگی ہیں۔ مگر قلم کو دفن کرنے والے تابوت بنانے والے کارخانے نہیں کھولے گئے۔ چھوت چھات جھاڑ پھونک ٹونے ٹوٹکے کرنے والے پنڈت سنیاسی بکثرت پائے جاتے ہیں۔ مگر کہانی کو بانجھ بنانے کا کوئی منتر ان کے قبضہ قدرت میں نہیں ہے۔ گھٹن اور مایوسی کے لمحوں میں یہاں کچھ لوگ پیچھے کی طرف دیکھنے لگتے ہیں۔ کھوئی جنتوں کے ٹوٹے تاروں کی تلاش و تاسف میں لگ جاتے ہیں۔ تصور کرتے ہیں کہ تم جیسا فنکار جو یہاں ہوتا تو ایسے موقعوں کے لئے جب فصلیں گروی رکھی جائیں اور گیت قیدی

بنائے جائیں تو کیسی کہانی لکھتا؟ مگر زیادہ مایوسی اور زیادہ گھٹن کے اگلے لمحے ایسے خیالات کو رد کردینا پڑتا ہے۔ کہ تم بھی یہاں رہ کر پتہ نہیں کس طرف کو اور کس طرح بدل گئے ہوتے۔ کون جانے تم انسانوں کی طرف کے رہتے یا نہ رہتے۔ کیا خبر تم بھی درباری ہو جاتے یا آخری وقت تک فنکار نہ رہتے۔ چاولوں کے بیوپاری بن گئے ہوتے۔ یا اس سے بھی آگے تک ترقیاں کر جاتے۔ گروی کھاتے والے بنک کے دلال یا کسی ملٹی نیشن کمپنی کے ڈائرکٹر یا مہتمم اعلیٰ بن جاتے اور جو کہیں ان بلندیوں کو چھونے کے لائق جوہر قابل تمہارے اندر سے نہ نکل سکتا تو تمہارے منہ میں بھی وہی ٹافیاں بھر دی جاتیں جن کے اندر تخلیق کے جرثومے ہلاک کرنے والا میٹھا مزے دار زہر ملا ہوتا ہے۔ خاص کمپنی کی بنائی ہوئی یہ خوش ذائقہ ٹافیاں تم تھوک دیتے مجھے تو اس کا بھی یقین ہے' کیوں کہ تم شروع سے دال چاول خور قسم کے آدمی تھے۔ مگر اس کے بعد یہ ہوتا کہ امن عامہ میں خلل ڈالنے کی فرد لگا کر تمہیں کسی بہت پرانی کوٹھی میں ایک نئے فرج کے ساتھ بند کر دیا جاتا۔ کاغذ قلم چھین کر یخ بستہ مشروب کی بوتلیں تمہارے ہاتھ میں تھما دی جاتیں۔ گھونٹ گھونٹ پی کر تم زندگی گزارتے اور کھوئی جنتوں کے تصور کے ساتھ ہی نئی جنتوں کی تعمیر کے لئے پلاٹ حاصل کرنے کی سازش پکاتے ہوئے بڑا شاندار کمپرو مائز Compromise کر کے باہر نکل آتے۔ جیسے کہ یہاں ہوتا ہے۔ لیکن تم تو کرشن چندر تھے۔ ممکن ہے تمہارے معاملے میں اس طرح کا سارا نقشہ خارج از امکان ہی رہ جاتا۔ سودا یا کمپرو مائز تم تو کچھ بھی نہ کرتے مگر ایسی صورت میں ہوتا کیا؟ یہی کہ آج تمہیں پھانسی پائے بہت سے برس بیت گئے ہوتے تمہاری بستی کا بڑا بت جس کے نیچے کھڑے ہو کر آج اوپر دیکھنے والوں کی گردن مڑ جاتی ہے اور ٹوپی گر جاتی ہے۔ یہاں رہ کر شاید چھوٹا سا گڈا بن جاتا۔ یہاں کے اخبار نویسوں کا کیا ہے وہ تو تمہیں اور بھی جانے کیا کچھ بنا ڈالتے۔ بڑے کہانی کار کے سوا اور سارے لقب دیتے سماج دشمن لکھ کر "بڑا مجرم" بنا لینے تک بڑی محنت ہوتی۔ بڑے قلم گھستے جانے کتنی سیاہی خرچ کرتے وہ ساتھ ہی تمہارے پرکھوں کی گزری پشتوں پر ان کے چال چلن کا ایک نیا ماسک چڑھا کر اوپر سے

یہ قانی صحافت کا پہلا چھینٹا دے کر کالے ،چٹے صحیفے چھاپ ڈالتے مگر اس طرح ہمارے ہاتھ جو پہلے ہی کھلے نہیں ہیں صرف تاسف کی علامت ہی بنے رہ جاتے نا۔ تمہیں بچا لینا ہمارے بس میں کہاں ہوتا۔ مگر آج تو تم نے ہمیں بچا لیا ہے۔ تمہاری کہانی ہر جگہ ہماری کمک پہ آئی ہے اور آتی رہے گی کہ وہ اب انسان کی خوشبو ہے۔ انسان جو ساری دنیا میں رہتا ہے۔ لیکن تمہاری کہانی کا پہلا انسان پنجاب میں آج بھی رہتا ہے۔ جہاں تم پیدا ہوئے اور جہاں تم نے قلم کے ساتھ اپنے ہاتھ کی انگلیوں کا لمس جوڑا۔ وہ پنج پانیوں کی زمین تمہارا وطن آج بھی ہے۔ کہ تم نے اسے نہیں Disown کیا۔ اور تم نے کسی اور دھرتی کو اپنے دل میں اس جگہ پہ نہیں لکھا جہاں تمہارے دیس کے نام لکھا ہوا تھا۔

سو کامریڈ کرشن چندر جی آج جب تمہاری کہانیاں پڑھتے ہوئے دور اور قریب کی زمینوں پر کھلنے والے سرخ اور سفید گلابوں کی مست خوشبو سے میرا دل مہک اٹھتا ہے۔ تو میں تمہارا شکریہ ادا کرتی ہوں۔ کہ تمہاری کہانیاں سدا کھلے رہنے والے گلاب بن گئی ہیں۔ یہ آزادی کی خوشبو ہے ادب لکھنے کی آزدی جو تمہیں ہندوستان نے دی اس کے بدلے تم نے انسان کو بہت پیاری خوشبوں کی سوغات بخشی۔ میں سو بار شکر ادا کرتی ہوں اس گھڑی کا جب تمہیں دیس نکالا دیا گیا! زندہ باد امن انقلاب کی خوشبو میں بسی ہوئی کہانی اور اس کی تہذیب!!

افضل توصیف

پہلا دیباچہ

ہندوستان اور پاکستان میں خانہ جنگی کی آگ لگی ہوئی ہے جس کے شعلوں میں انسانوں، مکانوں، اور کتب خانوں کے ساتھ ساتھ ہماری زندگی، آزادی تہذیب اور تمدن کے جل کر خاک ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ آج کئی مہینوں کے بعد یہ شعلے ہلکے پڑ گئے ہیں۔ لیکن ابھی ٹھنڈے نہیں ہوئے ہیں۔ راکھ کے نیچے بہت سی چنگاریاں دبی ہوئی ہیں جو ذرا سی پھونک سے بھڑک سکتی ہیں۔ ان کو ہوا دینے والے بھی موجود ہیں۔

لیکن آگ بجھانے والوں کی بھی کمی نہیں۔ ہندوستان اور پاکستان کے صحت مند اور ترقی پسند عناصر اس خانہ جنگی کو روکنے کی کوشش کر رہے ہیں اور یہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ کامیابی انہیں کو ہو گی۔ کیونکہ وقت، تاریخ اور مستقبل ان کے ساتھ ہے۔ زندگی کے تقاضے انہیں تقویت پہونچا رہے ہیں۔ انقلابی قوتیں انہیں سہارا دے رہی ہیں اور انسانیت کی بہترین روایات ان کی پشت پناہی پر ہیں۔

لیکن خانہ جنگی کے خلاف کامیاب جدوجہد اس وقت تک نہیں کی جا سکتی۔ جب تک اس کی حقیقی نوعیت کا علم نہ ہو اور آگ لگانے والے ہاتھ پہچان نہ لئے جائیں۔ جب تک اس کی حقیقی نوعیت کا علم نہ ہو اور آگ لگانے والے ہاتھ پہچان نہ لئے جائیں۔ جیسا کہ عام طور سے سمجھا جاتا ہے۔ آج کی خانہ جنگی ہندوؤں اور مسلمانوں کی باہمی نفرت کی لڑائی نہیں ہے بلکہ انقلاب اور آزادی کے قلعے پر انقلاب دشمن لشکر کا حملہ ہے جسے ہندوؤں اور مسلمانوں کے دلوں کے بیر سے تقویت پہنچ رہی ہے۔

یہ لشکر منظم ہے، مسلح ہے۔ اس لئے داؤ پیچ بہت سوچ سمجھ کر وضع کیئے گئے ہیں۔ دراصل اس حملے کی زد پر پاکستان اور ہندوستان کی اقلیتیں نہیں ہیں۔ اقلیتوں کا تو صرف بہانہ ہے۔ اصلی حملہ چالیس کروڑ ہندوستانی اور پاکستانی عوام پر ہے۔ اس آزادی پر ہے جو ابھی پچاس سال کی قربانیوں کے بعد بھی حاصل نہیں ہوئی ہے۔ اس قوت پر ہے جو انقلابی تحریک کی گاڑی کو چلا رہی ہے۔ ان جماعتوں پر ہے جو آزادی کی علمبردار ہیں۔

اس رجعت پرست انقلاب دشمن کو منظم کرنے والے انگریز سامراجی انگریز فوجی افسر اور انگریز حکام ہیں جو ہندوستان اور پاکستان میں قومی حکومتیں بن جانے کے بعد بھی نظم و نسق کی باگ ڈور سنبھالے ہوئے ہیں۔ آج ان کی سازش کا بھانڈا پھوٹ چکا ہے۔ ۴ ستمبر کے "پاکستان ٹائمز" میں پنجاب پولیس کے ایک انگریز افسر جینکس کا جو خط شائع ہوا ہے وہ انگریزوں کی سازش کو بے نقاب کرنے کے لئے کافی ہے۔ بعد کے واقعات بھی اس کی شہادت دیتے ہیں۔ باؤنڈری فورس کے کرتوت سے کون واقف نہیں ہے جس نے انگریز افسروں کی رہنمائی میں مشرقی پنجاب کے مسلمانوں پر اور مغربی پنجاب کے ہندوؤں اور سکھوں پر گولی چلائی۔ پنجاب کے حاکموں نے فساد کرنے والے غنڈوں کی امداد کی۔ دہلی میں نوکر شاہی نے ہندوستان کے وزیر اعظم جواہر لال نہرو تک کی پرواہ نہیں کی۔ اور مسلم اقلیت کا فرض پورا نہیں کیا۔ دہلی کے ہنگامے کی سازش میں فوجی افسر شامل تھے۔ یہی حال پاکستان میں ہوا۔

برطانوی سلطنت کا آفتاب جو دو سو برس سے انسانیت کو جھلسا رہا تھا ڈوب چکا ہے۔ ان کی حکومت کی منحوس بساط الٹ چکی ہے، یورپ میں ان کا اقتدار ختم ہو گیا ہے۔ ایشیا میں آخری ہچکیاں لے رہا ہے۔ ان کی سانس کا ڈورا ہندوستان میں ٹوٹ رہا ہے۔ فرنگی چال بازوں نے اپنے آپ کو بچانے کی نئی ترکیب سوچی۔ انھیں معلوم تھا کہ وہ اب ہندوستان پر اپنی فوجی طاقت سے حکومت نہیں کر سکتے اس لئے انہوں نے ہماری شاندار تحریک آزادی کی بعض کمزوریوں اور خصوصیت کے ساتھ ہندو مسلم نفاق سے فائدہ اٹھایا جو انگریزی سیاست کے علاوہ ہماری قومی قیادت کی سرمایہ دارانہ

ذہنیتوں سے پیدا ہوا تھا اور کہا کہ ہم پرامن طریقے سے اقتدار منتقل کر دیں گے۔ اس طرح انہوں نے اپنے آپ کو عوامی قوت کے آخری وار سے محفوظ کر لیا۔ ان کے ساتھ ہندوستان کے رجعت پرست عناصر بھی محفوظ ہو گئے۔ جنہیں خود فرنگیوں نے جنم دیا تھا۔ ملک کی تقسیم کے ساتھ ساتھ انہوں نے فوجوں کو بھی مذہبی بنیاد پر تقسیم کر دیا اور اپنے گرگوں اور کتوں کو دیسی راجواڑوں کی شکل میں آزاد کر دیا۔ ان کے گلوں کے پٹے اتار دیئے گئے اور زنجیریں کھول دی گئیں۔ ہندوؤں، مسلمانوں، اور سکھوں کو بھڑکانے کے لئے انگریز نوکر شاہی موجود ہی تھی۔ ان کو مسلح کرنے اور فوجی تربیت دینے کے لئے دیسی راجواڑوں نے اپنی خدمات پیش کر دیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ پنجاب کی خانہ جنگی میں جو ہتھیار استعمال ہوئے ہیں وہ دیسی ریاستوں نے مہیا کئے جن میں پٹیالہ اور فرید کوٹ کی سکھ ریاستیں اور بہاولپور کی مسلم ریاست پیش پیش تھیں۔ ان میں زیادہ تر جنرل ہیڈ کوارٹر کے وہ ہتھیار تھے جو انگریزوں نے دیسی راجواڑوں کے سپرد کر دیئے تھے۔

رجعت پرست عناصر کی تنظیم اکالیوں کے "شہیدی دل" ہندوؤں کے "راشٹری سیوا سنگھ" اور مسلمانوں کے "مسلم نیشنل گارڈ" کی شکل میں ہوئی۔ ان رجعت پرستوں نے ہندوستان میں ہندو حکومت اور پاکستان میں مسلم حکومت کے نعرے بلند کئے اور جمہوریت اور آزادی کی ناؤ انسانی خون کے بھنور میں چکرانے لگی۔

آج مشرقی پنجاب میں ایک بھی مسلمان باقی نہیں ہے۔ مغربی پنجاب میں کوئی سکھ یا ہندو دکھائی نہیں دیتا۔ سینکڑوں برس پرانی بستیاں لٹ گئیں۔ ہزاروں ہندو مسلمان اور سکھ عورتوں کے ساتھ سڑکوں اور بازاروں میں زنا کیا گیا۔ لاکھوں آدمی موت کے گھاٹ اتر گئے۔ ایک کروڑ کے قریب انسان بے گھر ہو گئے۔ کھیتیاں اجڑ گئیں۔ کارخانے بند ہو گئے۔ کتابوں کی دکانیں اور ذخیرے جل گئے۔ مکتبوں اور مدرسوں میں الو بولنے لگے۔ ہوائیں لاشوں کے تعفن سے گندی ہو گئیں۔ دریاؤں کے پانی سے بو آنے لگی۔ انگریزوں نے پرامن طریقے سے جو اقتدار منتقل کیا تھا وہ ہمارے اپنے ہی بھائیوں کے خون میں ڈوب گیا۔ انگریزوں کا امن ہندوستانیوں کی خانہ جنگی میں تبدیل

ہو گیا۔ ظاہر ہے کہ اگر پھوڑے کو چیرا نہ جائے گا تو وہ جسم میں زہر پھیلا دے گا۔

لیکن کیا انگریز سامراجیوں' فرنگی حاکموں' دیسی راجواڑوں اور ہندو مسلم اور سکھ رجعت پرستوں کو الزام دے کر ہم اپنے ترقی پسند ضمیر اور مہذب دل کو مطمئن کر سکتے ہیں؟ کیا ہم نے اپنے فرائض انجام دیئے ہیں؟ ہمیں اپنے عمل کا بھی جائزہ لینا پڑے گا۔ ہمارے گھر میں رجعت پرست عناصر کا وجود اس کا ثبوت ہے کہ ترقی پسند قوتوں میں ابھی کچھ کمزوریاں باقی ہیں۔ اور اس کمزوری کی ذمہ داری ہمارے اوپر ہے۔ ہماری قومی آزادی کی تحریکوں اور ہمارے رہنماؤں کی سیاست کے اوپر ہے۔ یہ خانہ جنگی فرنگی سیاست کی کامیابی کی دلیل ہے اور اس کے خاف انقلابی جدوجہد کرنے کے لئے ہمیں' ہمیں اپنی صفوں کو پھر سے آراستہ کرنا پڑے گا۔ نئے مورچے زیادہ مضبوط بنانے پڑیں گے اور نیا حملہ زیادہ ہمت سے کرنا پڑے گا۔

ایک اور بھی بڑا سوال ہے۔ نفرت کا جو زہر عام انسانوں میں سرایت کر گیا ہے اسے کیسے نکالا جائے۔ ہندوستان کے ہندوؤں اور سکھوں نے اور پاکستان کے مسلمانوں نے اس خانہ جنگی میں جس بربریت اور درندگی کا اظہار کیا ہے اس کے تصور ہی سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اس ملک میں کبھی گوتم بدھ پیدا ہی نہیں ہوا تھا۔ ایشیا کے کانوں نے عرب کے رسول کی آواز کبھی سنی ہی نہیں تھی۔ جیسے اجنتا کے نقوش کبھی نہیں ابھرے تھے۔ الورا کے بت کبھی نہیں تراشے گئے تھے۔ تاج محل کبھی نہیں بنایا گیا تھا۔ ٹیگور اور اقبال نے اپنے گیت کبھی نہیں گائے تھے۔

اس وقت ملک میں چاروں طرف نفرت کا دور دورہ ہے۔ وہ لوگ بھی جو فساد نہیں چاہتے اس نفرت کا شکار ہو رہے ہیں۔ بہت سے نیشنلسٹ یہ کہتے سنائی دیتے ہیں کہ ہندوستان سے سارے مسلمانوں کو نکال دو۔ ایک پاکستانی ادیب نے مجھے لکھا ہے کہ سکھ کا نام سن کر میرا خون کھولنے لگتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے سارے ہندوستان اور پاکستان کے ایک ایک رونگٹے سے نفرت خون کی طرح رس رہی ہے۔ انسان کی صدیوں پرانی وحشت بیدار ہو گئی ہے اور تہذیب و تمدن کا خول سانپ کی

کینچلی کی طرح اتر گیا ہے۔ وہ درندہ جو آج سے کئی ہزار برس پہلے پہاڑوں کے غاروں اور درختوں کے کھوکھلے تنوں میں رہتا تھا۔ آج مہذب بستیوں میں اپنے خونیں دانت نکالے ہوئے پھر رہا ہے۔

مشرقی اور مغربی پنجاب کی معاشی اور سیاسی بربادی کا غم بہت ہے' لیکن اس سے بڑا دکھ تو یہ ہے کہ ہم کتنے ذلیل ہو گئے ہیں۔ دنیا کی نظروں میں ہماری کیا آبرو رہ جائے گی۔ مانا کہ قتل و غارت گری کی ذمہ داری غنڈوں اور رجعت پرستوں پر ہے لیکن بحیثیت انسان کے ہم ہر اس بچے کی موت کے ذمہ دار ہیں جو چاہے پاکستان میں مارا گیا ہو چاہے ہندوستان میں۔ اور اس سے زیادہ ہم ان قاتلوں کے اخلاق و کردار کے ذمہ دار ہیں' جن کی تعداد اگر لاکھوں نہیں تو ہزاروں میں ضرور ہے۔ وہ ہماری سماجی اور مجلسی زندگی میں برابر کے شریک ہوں گے۔ میں سوچتا ہوں کہ ان کی نفسیاتی کیفیت کیا ہو گی۔ وہ سوتے میں کیسے خواب دیکھیں گے۔ جب وہ اپنی بیویوں کو پیار کریں گے تو ان کے کانوں میں کسی کی چیخوں کی آواز آئے گی یا نہیں اور جب وہ اپنے بچوں کو گود میں لے کر کھلائیں گے تو انہیں کیسی کہانیاں سنائیں گے۔ ہلونت گارگی نے ایک ایسا قاتل کو دیکھا ہے۔ وہ سوتے میں بڑاتا ہے۔ پہلے کہتا ہے۔ مارو' مارو' پھر خود ہی چلاتا ہے "مجھے مت مارو بچا لو۔" اس کی انسانی روح اس کی درندگی کے خلاف احتجاج کر رہی ہے۔ اس کا ضمیر فریاد کر رہا ہے۔ اس نے دوسرے انسانوں کے قتل کے ساتھ ساتھ اس انسان کو بھی قتل کر دیا ہے جو اس کے سینے کے اندر تھا۔ ایسا آدمی ہماری سماجی اور مجلسی زندگی پر کیا اثر ڈالے گا۔

میں سوچتا ہوں کہ ملک میں امن قائم ہو جائے گا۔ اجڑے ہوئے کھیت پھر لہلہانے لگیں گے۔ ہم اپنے بازوؤں کی قوت سے دیو ہیکل مشینیں کھڑی کر دیں گے۔ لیکن ان قاتلوں کا ضمیر کیسے پاک ہو سکے گا۔ جنہوں نے اپنی بہنوں کے ساتھ زنا کیا ہے۔ جنہوں نے ننگی عورتوں کے جلوس نکال کر اللہ اکبر' ست سری کال اور ہر ہر مہادیو کے نعرے بلند کئے ہیں۔ جنہوں نے ماؤں کی دودھ بھری چھاتیاں کاٹی ہیں اور بچوں کی لاشوں کو نیزوں پر اٹھا کر قہقہے لگائے ہیں ہم اس اناج کو کیسے کھا سکیں گے جو

ان کھیتوں سے پیدا ہو گا۔ جن کی خاک میں ہزاروں بے گناہوں کی لاشیں کھاد بن گئی ہیں۔ کیا کوئی بتا سکتا ہے کہ وہ بچے بڑے ہو کر کیسے ہوں گے جنہیں لاشوں کے بیچ میں رینگنا پڑا ہے۔ ان لڑکیوں کی محبت کیسی ہو گی جن کے دلوں میں مرد کی دہشت سمائی ہوئی ہے۔ جن کی عصمت آزادی کے نام پر لوٹی گئی ہے اور جن کے پیٹ میں نفرت کے بیج زندگی کی کلی بن کر کھل رہے ہیں۔ وہ لوگ کیسے ہوں گے جو موت کے منہ سے باہر نکل آئے ہیں اور اب ان کے ایک ایک رونگٹے میں خون بھرا ہوا ہے۔

ہمیں صرف آزادی کی مسلی ہوئی کونپلوں کی آب یاری ہی نہیں کرنی ہے، فتح کی ٹوٹی ہوئی خوبصورت محرابوں ہی کو نہیں جوڑنا ہے بلکہ غلامی کے اس کوڑھ کا علاج بھی کرنا ہے۔ جو ہمارے جسموں سے دلوں اور روحوں سے نفرت انتقام اور فساد بن کر ٹپک رہا ہے۔ صدیوں پرانا غاروں میں رہنے والا درندہ ابھی پوری طرح انسان نہیں بنا ہے۔ ہمیں خود اپنی انسانیت کی تربیت کرنی ہے۔ سیاسی آزادی کے ساتھ ساتھ روحانی پاکیزگی کے لئے بھی جدوجہد ضروری ہے۔

کہتے ہیں کہ پرانے زمانے میں دیوتاؤں اور راکھشوں میں لڑائی ہوئی تو انہوں نے سمندر کو متھ ڈالا۔ اس میں سے پہلے امرت نکلے اور پھر زہر اور شیو نے دنیا کو بچانے کے لئے وہ زہر پی لیا۔ آج ہندوستان سچ مچ ایک متھے ہوئے سمندر کی طرح ہے۔ جس میں سے آزادی کا امرت بھی نکلا ہے اور نفرت اور خانہ جنگی کا زہر بھی۔ اس کو پینے کے لئے ایک شیو کافی نہیں۔ کروڑوں کی ضرورت ہے۔ فقط چند انسان اس زہر کو اپنے حلق کے نیچے نہیں اتار سکتے بلکہ ہم سب کو مل کر ایک ایک بچے، ایک ایک عورت، ایک ایک مرد کو یہ زہر پینا پڑے گا۔ نہیں تو سب بھسم ہو جائے گا۔

ہمیں ادیبوں کی حیثیت سے اپنے فرائض پورے کرنے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اردو کے ادیب جاگ رہے ہیں اور وہ اس وحشت، درندگی اور روح کے گھناؤنے پن کو محسوس کر رہے ہیں جس نے ہندوستانی زندگی کو روگ لگا دیا ہے۔ بمبئی کے ادیبوں اور فن کاروں نے امن کا جلوس نکالا۔ پاکستان کے ادیب اپنی کانفرنس کر رہے ہیں۔ لیکن اکثریت کی زبانیں ابھی گنگ ہیں۔ ان کے قلم خاموش

ہیں۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے اور پندرناتھ اشک، عصمت چغتائی، احمد عباس، کیفی اعظمی، یوسف، فکر تونسوی اور کرشن چندر کے علاوہ کسی ادیب نے فساد پر قلم نہیں اٹھایا ہے۔ اب تو جو کچھ لکھا گیا ہے وہ بہت اچھا ہے۔ لیکن کافی نہیں ہے۔ یہ نقار خانے میں طوطی کی آواز کے برابر ہے۔ غنڈوں کے چھرے قلم سے زیادہ تیز چل رہے ہیں۔ ان کی بندوقوں کی آوازیں شاعروں کی آوازوں سے زیادہ بلند ہیں۔ انسانی خون کا سیلاب ان ادب پاروں کو بہا لے جائے گا۔ ہمیں ابھی اتنی کتابیں لکھنی ہیں کہ ہم ان کے ڈھیر سے بند باندھ سکیں۔ پشتے بنا سکیں۔ اس کو ہنگامی ادب کہہ کر صرف وہی لوگ ٹال سکتے ہیں جن کی روحیں سڑ گئی ہیں اور شعر، ادب و فن کے چشمے خشک ہو گئے ہیں۔

آج چالیس کروڑ ہندوستانی اور پاکستانی ایک ایک ادیب اور ایک ایک شاعر کو نام لے لے کر آواز دے رہے ہیں۔ تم نے ہمارے گونگے جذبات کو زبان عطا کی تھی۔ آؤ اور ہمارے دلوں کے نئے زخم دیکھو، اپنے چاروں طرف مڑ کر دیکھو، تمہیں بے شمار سہمی ہوئی آنکھیں نظر آئیں گی۔ سنو ہمارے اینٹھے ہوئے ہونٹوں پر کون سے لفظ تڑپ رہے ہیں۔ ہمارے سینوں میں کیسے نعرے جکڑے ہوئے ہیں جو نکل آنے کے لئے بیتاب ہیں۔ تم ان گیتوں کو گا سکتے ہو جو ہم گانا چاہتے تھے اور نہیں گا سکے۔ تم ان کہانیوں کو سنا سکتے ہو جو لہو لہان ہو گئی ہیں۔ ان ادھورے خوابوں کو پورا کر سکتے ہو جن کے تاروپود بکھر گئے ہیں۔

آج ہندوستان کی آواز آ رہی ہے۔ پاکستان کی آواز آ رہی ہے۔ چالیس کروڑ انسانوں کی آواز آ رہی ہے اور انہیں کے ساتھ ادیبوں اور شاعروں کی آوازیں بھی آ رہی ہیں۔ جن میں کرشن چندر کی آواز سب سے زیادہ بلند ہے لیکن یہ آوازیں بھی دھیمی ہیں۔ ان میں آہستہ آہستہ بجلیوں کی کڑک اور بادلوں کی گرج پیدا ہو رہی ہے۔
لیکن دنیا ہندوستان کے قہقہے کی منتظر ہے۔

سردار جعفری
بمبئی

۱۶ نومبر ۱۹۴۷ء

اندھے

چوک بمبئی کے اندر کوچہ پیر جہازی میں صرف دو گھر ہندوؤں کے تھے۔ ایک سہ منزلہ مکان، گلی میں سب سے اونچا اور خوش حال مکان لالہ بانشی رام کھتری کا تھا یہ پنجابی کھتری نہ تھے۔ یوپی کے کھتری تھے، اور ہر وقت ہندستانی میں بات کرتے تھے۔ اس لئے سب پنجابیوں کو ان سے نفرت تھی۔ سالوں کی زبان کیا کترنی کی طرح چلتی تھی۔ ان کے گھر کی عورتیں ناچ گانے کی بڑی شوقین تھیں۔ ریڈیو ہر وقت چلتا رہتا۔ پشپا گھر کی سب سے چھوٹی لڑکی سولہ سترہ برس کی ہوگی اور اکثر سہ منزلہ عمارت کی چھت پر کھڑی ہو کر مجھے اکسانے کے لئے ناچ کیا کرتی۔ میں اپنے مکان کی چھت پر سے اور وہ اپنے مکان کی چھت سے ایک دوسرے سے عشق کیا کرتے۔ مگر میں مسلمان تھا اور وہ ہندو، میں چمار تھا اور وہ کھتری اور وہ بھی یو پی کے۔ پھر پشپا تو کیا گھر کی دوسری عورتیں بھی کبھی گلی میں اکیلی نہ دکھائی دیتیں۔ وہ لوگ بانشی باغ سیر کو بھی جاتے تو موٹر میں بیٹھ کر۔ یہاں ہمارے گھروں کی عورتوں کو بازار سے سودا سلف بھی لانا پڑتا۔ پردہ سنبھالنا تک مشکل تھا۔ ایسی صورت میں ہر شریف مسلمان محلے والے کو لالہ بانشی رام کھتری کے گھرانے سے چڑ تھی اور یوں بھی تو یہ لوگ بہت کمینے تھے۔ مسلمانوں کو اچھا نہیں سمجھتے تھے۔ اور ایمان کی بات تو یہ ہے کہ کون کافر ایسا ہے جو مسلمانوں سے دھوکا نہ کرتا ہو۔ یہ تو ان لوگوں کے خمیر میں ہے۔ ہندو مسلمان کا سا دل نہیں رکھتا۔ جس طرح مسلمان صاف اور کھری بات سب کے سامنے کہہ دیتا ہے۔ ہندو تو بس زبان کا میٹھا ہے۔ اندر سے بس بھرا ہے جس نے ہندو بچے

پر اعتبار کیا وہ مرا۔

دوسرا گھر رام نرائن برہمن کا ہے۔ یہ گھر بالکل ہمارے گھر کے سامنے ہے۔ رام نرائن کی ماں ایک لڑاکا عورت ہے۔ محلے بھر کی عورتیں ایک طرف اور وہ ایک طرف' زبانی گالی گلوچ میں کوئی اس سے بازی نہیں لے جا سکتا۔ ایسے کڑوے کرخت لہجے میں بات کرتی ہے کہ آدمی کا جی جل کے کباب ہو جاتا ہے۔ ہمارے ہاں چمارنیں طعنے تشنیع' گالی گلوچ میں بے حد ہوشیار ہیں مگر رام نرائن کی ماں کے آگے وہ بھی ہاتھ جوڑتی ہیں۔ سارا محلے اس سے ناراض تھا۔ رام نرائن خود بے حد شریف برہمن تھا۔ گائے کی طرح ست رفتار اور بھولا بھولا سا۔ ہر وقت اپنے دھرم دان میں مگن تھا۔ ہر ایک سے ہنس کر بات کرتا۔ میں نے کبھی اس کے منہ سے گالی نہیں سنی۔ کوئی کڑوا بول نہیں سنا۔ محلے بھر میں کسی سے لڑائی نہیں لیتا۔ ایسا آدمی بھی کس کام کا۔ یعنی کسی بات پر لڑے گا ہی نہیں۔ اب جب دوسرا آدمی اس قدر میٹھا ہو تو ہم کس طرح اس سے جھگڑیں۔ اس سے جھگڑنے کو بہت جی چاہتا تھا۔ مگر ہمیشہ طرح دے جاتا۔ مجھے تو ایسے آدمیوں سے سخت کد ہے۔ اب بھی ایک ہی محلے میں رہتے ہیں۔ کبھی تو برتن ساتھ ساتھ رکھے ہوئے کھڑکھڑا اٹھتے ہیں اور ایک تم ہو کہ کبھی بولتے ہی نہیں۔ رام نرائن کو جب دیکھو بھیگی بلی بنا ہوا ہے سر جھکائے گلی سے باہر آ رہا ہے۔ گھر کے اندر جا رہا ہے۔ کسی نے بلایا۔ جھٹ بتیسی نکال کے ہاتھ جوڑ دیئے۔ بڑا ہی بزدل براہمن تھا مال خور۔

رام نرائن کے تین بچے تھے۔ تینوں اسکول میں پڑھتے تھے۔ چوتھا لڑکا کوئی ایک سال کا ہو گا۔ اسے اکثر میں نے رام نرائن کی بیوی کے تھنوں سے لٹکتے ہوئے اس کے گھر کے دروازے پر دیکھتا تھا۔ یہ ہندو عورتیں کس قدر بے حیا ہوتی ہیں۔ نہ پردہ' نہ شرم' نہ لاج' سب کے سامنے چھاتی کھول کے دودھ پلانے لگتی ہیں۔ اپنے بچوں کو' اور یہ بچے بھی کیا چسر چسر دودھ پیتے ہیں۔ اور جب فساد شروع ہوا۔ تو شروع شروع میں یہاں صلح کمیٹی بنی۔ اس میں رام نرائن اور لالہ بانشی رام کھتری بھی شریک تھے۔ ہم لوگ اس جھنجھٹ میں نہیں تھے۔ مسلمان کی طرف سے ہم نے مسجد کے ملا جی

اور لکڑیوں کے ٹال کے مالک فتح محمد کو بھیج دیا تھا۔ دراصل ہمارا جی اس صلح کمیٹی میں نہ تھا۔ کوئی چھیڑ چھاڑ ہو، مار پیٹ ہو، دھول دھپا ہو، تو اس میں مزا ہے۔ یہ کیا اندر ہی اندر تو بغض بھرا ہے اور اوپر سے صلح کمیٹیاں بنا رہے ہیں۔ ہم نے سوچا چلو انہیں صلح کمیٹیاں بنانے دو یہ چلنے چلانے کی چیزیں نہیں ہیں، لالہ بانشی رام کھتری بہت پریشان معلوم ہوتے تھے اور اس سلسلے میں بہت دوڑ دھوپ کر رہے تھے۔ چوہدری فتح محمد نے ان سے صاف کہہ دیا کہ اگر وہ ٹھیک ڈھنگ سے رہے تو کوئی مسلمان ان پر ہاتھ نہیں اٹھائے گا۔ ہاں اگر انہوں نے زیادہ چیں چپٹ کی اور فوں فاں سے کام لیا تو ان کی جان و مال کی خیر نہیں۔ لالہ بانشی رام بھری مجلس میں ہاتھ جوڑ کے کھڑے ہو گئے، بولے ہم تو پچاس برس سے آپ کے ہمسائے ہیں۔ ہمارے دادا ملکھن رام آنریری مجسٹریٹ بھی یہیں رہتے تھے۔ یہ سن کر بڈھا پیراں بخش بولا۔ ان کی بات رہنے دو۔ ایک ہی حرامی تھا، تمہارا دادا ملکھن رام آنریری مجسٹریٹ میرے بیٹے کو چھ ماہ قید اسی نے سنائی تھی۔ اور کیا ذرا سی بات تھی۔ میرے بیٹے نے اس کی دکان سے دس روپے اٹھا لئے تھے۔ ابھی بڈھا پیراں بخش کچھ اور کہنا چاہ رہا تھا کہ لوگوں نے بیچ بچاؤ کر کے اسے چپ کرا دیا۔ لالہ بانشی رام بہت خفیف ہوئے۔ مگر انہوں نے چپ رہنے ہی میں مصلحت سمجھی اور اگر لالہ بولتا بھی تو بری طرح پٹتا۔ کئی مسلمان جوان ایسے تھے جو وہ ذرا بھی ایسا ویسا کلمہ منہ سے نکالتا اس کی کھال وہیں ادھیڑ کے رکھ دیتے۔ خیر یہ صلح کمیٹی تھی۔ کتنے دن رہتی ختم ہو گئی۔

پہلے تو کوئی نہیں بولا پر جب بہار میں مسلمانوں میں آفت آن پڑی تو ہمارا خون بھی کھولنے لگا۔ یہ سالے اوپر چڑھے جا رہے ہیں۔ ارے ابھی کل کی بات ہے کہ ہم سارے ہندوستان کے بادشاہ تھے اور یہ دال کھانے والے کافر ہماری جوتیوں تلے لوٹتے تھے اور آج ان کی یہ ہمت ہو گئی۔ چنانچہ میں نے اور رشید بھائی نے اور بگے موچی نے اور گلے پہلوان نے اور گلی کے دوسرے آٹھ دس جوان جوان چھوکروں نے فیصلے کر لیا کہ یہاں ہندوؤں کو اس کا مزا چکھا کے رہیں گے۔ مسجد کے ملا نے خلاف توقع اس کے لئے ہمیں برا بھلا کہا۔ پر ہم یوں تو چپ رہے مگر اندر ہی اندر اپنی اسکیم کی

یونہی تیاری کرتے رہے۔ دو چار دنوں میں ہم نے اپنے گھروں کی عورتوں کو بھاٹی گیٹ بھیج دیا۔ کیونکہ چوک متی کا کوچہ پیر جہازی لاکھ مسلمانوں کا محلّہ سہی۔ پھر بھی شاہ عالمی کا دروازہ یہاں سے بہت قریب ہے اور شاہ عالمی کے دروازے میں ہندوؤں کا بڑا زور تھا۔ کسی وقت بھی یہاں حملہ ہو سکتا تھا۔ ہم نے یہی مناسب سمجھا کہ اپنی عورتوں اور بچوں کو بھاٹی گیٹ بھیج کر بے فکر ہو جائیں۔ چنانچہ ہم لوگوں نے ایسا ہی کیا۔ اس کے تھوڑے دنوں کے بعد ہی فساد شروع ہو گیا۔ شروع ہندوؤں نے کیا۔ کرشنا گلی میں۔ رام گلی میں۔ کرشن نگر میں۔ سنت نگر میں۔ شاہ عالمیں میں؟؟ جہاں جہاں لاہور میں ہندوؤں کا زور تھا۔ وہاں اکے دکے مسلمان مارے جانے لگے۔ اب ہم لوگ کہاں تک چپ رہتے۔ مسلمان غریب ہو۔ بے وقوف ہو۔ نکما ہو۔ مگر وہ بزدل نہیں ہے۔ ایک دفعہ اللہ کا نام لے کر جو لاہور کا مسلمان اٹھا تو دو روز ہی میں ہندوؤں اور سکھوں کو اپنی نانی یاد آ گئی۔ اکبری دروازے سے بھاٹی گیٹ تک اور شاہ عالمی سے شاہی محلے تک ہر جگہ نعرہ تکبیر سنائی دینے لگا۔ سب بنئے' لالے' کھتری' برہمن' اپنی ماں کی گود میں دبک کر بیٹھ گئے۔

کوچہ پیر جہازی کے نوجوان مسلمان بھی کہاں چپ بیٹھنے والے تھے۔ پہلے تو ہم نے لالہ بانشی رام کھتری کے مکان کے اندر گھس جانے کی کوشش کی۔ مگر اس بد معاش ہندو نے بڑا پکا انتظام کر رکھا تھا۔ لوہے کا دروازہ اس نے حال ہی میں لگایا اور مکان کے عقب میں ہندوؤں کا محلّہ تھا۔ سربن کا محلّہ جہاں کئی مسلمانوں کی جانیں جا چکی تھیں اس لئے ہم لوگ عقب سے حملہ نہ کر سکتے تھے اور سامنے لوہے کا دروازہ تھا۔ دو تین بار ہلہ بول کے ہم لوگ چپ ہو گئے۔ آخر تنگ آ کے ہم نے اس کے گھر کو آگ لگا دی۔ اب کیا کیا جائے۔ اس کے گھر میں کئی نادر اور قیمتی اشیاء تھیں اور سنا ہے کہ بہت زیور اور اناج بھی تھا۔ پر ہمیں کچھ نہ ملا۔ مکان ایسے جلا جیسے سوکھی لکڑی چولہے میں چیخ چیخ کر جلتی ہے۔ شعلے دور دور تک دکھائی دے رہے تھے لالہ بانشی رام نے اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو بچانے کی بڑی کوشش کی۔ مگر بچارا کامیاب نہ ہوا۔ بہت بہت منتیں خوشامدیں اس نے کیں۔ مگر ہم لوگ ہنسا

کہیئے۔ بس مجھے ایک پشپا کے مرنے کا افسوس ہے۔ میرے بس میں ہوتا تو میں اسے مرنے سے بچا لیتا۔ وہ مکان کے اندر اندر آگ میں جل کے مر گئی اور میں کچھ نہ کر سکا۔ کرتا بھی کیا اس وقت لوگ کہتے۔ مسلمان ہو کے ہندو کی طرف داری کرتا ہے۔ اس خیال سے چپ ہو گیا۔ مرتے وقت نجانے اس کی کیا حالت تھی۔ تیسری منزل سے اوپر کی چھت کی طرف تو اس نے اسے جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ پریشانی کے عالم میں بھاگ رہی تھی۔ لالہ بانشی رام کی بیوی کے سارے کپڑے جل رہے تھے اور اس نے تیسری چھت سے نیچے چھلانگ لگا دی تھی۔ خیر جلتی آگ سے کون بچ سکتا ہے۔

جب لالہ بانشی رام کا مکان جل رہا تھا تو کسی نے دیکھا کہ ہندوؤں کا دوسرا گھر اسی طرح محفوظ و مامون ہے سب لوگ رام نرائن برہمن کے گھر کی طرف دیکھنے لگے۔ جو اس وقت سب کے سامنے مجسم سوال تھا۔ پھر ہم سب لوگ اس گھر کی طرف بڑھے۔ یہاں معمولی سا کواڑ تھا۔ چٹخنی اندر سے لگی تھی۔ دروازہ کھٹ کھٹانے پر بھی جب کسی نے جواب نہ دیا۔ تو رشید بھائی نے اور گلے پہلوان نے شانوں سے ٹکریں لگا کر دروازے کو توڑ دیا۔ اندر سامنے ہی رام نرائن برہمن ہاتھ جوڑے کھڑا تھا بے چارہ تھر تھر کانپ رہا تھا۔

رشید نے پوچھا۔ ''دروازہ کیوں نہیں کھولا' سؤر۔''

جی - جی - میں سو رہا تھا۔

مجھے بڑی ہنسی آئی۔ مگر میں نے ضبط کیا۔

گلے پہلوان نے کہا ۔ ''اب یہاں کھڑا کھڑا کیا کر رہا ہے۔ چل باہر چل۔''

''باہر جا کے کیا کروں گا۔''

''باہر تو نکل۔ یہاں کھڑا کھڑا کیا جواب دیتا ہے۔''

گلے پہلوان نے اس کی گدی پر ہاتھ رکھا اور اسے ایک دھکا جو دیا۔ تو سیدھا چوکھٹ سے باہر۔وہ چوکھٹ سے باہر گر رہا تھا کہ بجے نے اس کی پیٹھ میں چاقو مارا اور وہ وہیں دھڑام سے فرش پر گر کر تڑپنے لگا۔ اس کی ماں روتی پیٹتی باہر آئی۔ بجے نے اسے بھی چاقو مارا اور وہ بھی وہیں ڈھیر ہو گئی۔ اپنے بیٹے کی تڑپتی ہوئی لاش پر گر گئی۔

اس کے بعد رام نرائن کی بیوی کی باری آئی۔ اس نے زیادہ مزاحمت نہ کی' چار بچوں کی ماں تھی اور بدصورت۔ کوئی اسے مسلمان بنانے کے لئے بھی تیار نہ تھا۔ لیکن حیرت کی بات تو یہ ہے کہ اس کا سب سے چھوٹا لڑکا جو ایک سال کا تھا اب تک پنگوڑے میں پڑا سو رہا تھا۔ نہایت اطمینان سے جیسے کچھ ہوا نہ تھا۔ ہم سب لوگ پنگوڑے کی طرف گئے۔ بچہ سو رہا تھا۔ رشید نے چھُرا نکالا۔ یکایک میرے ہاتھ نے اسے روک دیا۔

"کیوں" رشید نے کہا "سانپ کا بچہ ہے۔"

"جانے دو۔" میں نے کہا۔ "بڑا ہو گا' مار ڈالیں گے۔"

"نہیں"۔ بجے نے ذرا نرمی سے کہا۔

"نہیں۔" میں نے سختی سے کہا۔ چھوڑ دو اسے۔ دراصل مجھے اپنا ننھا یعقوب یاد آ گیا تھا۔ اس کی عمر بھی اس وقت ایک سال کی تھی۔ بچے کو چھوڑ کر ہم لوگ گھر کا سازو سامان دیکھنے لگے ڈیڑھ دو ہزار کے زیور ملے اور آٹھ سو روپیہ نقد' یہ ہم لوگوں نے آپس میں بانٹ لئے۔ کپڑوں کے صندوق میں بچوں کے کپڑے تھے جو ابھی اسکول سے واپس نہ آئے تھے۔ رام نرائن کی ماں کی شادی کے جوڑے جو اس نے اب تک سنبھال کر رکھے ہوئے تھے۔ پھر خود رام نرائن کی بیوی کے جہیز کے کپڑے تھے۔ یہ بھی ہم لوگوں نے بانٹ لئے۔ میرے حصے میں چھ ریشمی ساڑھیاں آئیں' اور دوسرے سوتی کپڑے۔ گہنوں میں میں نے اپنی بیوی کے کانوں کے لئے آویزے پسند کئے۔ اور ماتھے کا جھومر۔ اور ایک چاندی کا گلاس۔ مال غنیمت سمیٹ کر ہم لوگوں نے نعرہ تکبیر بلند کیا۔ باہر فرش خون سے لال تھا اور گوبھی کے گلے سڑے ٹکڑوں اور ناکارہ چمڑے کے تراشوں اور کیلے کے چھلکوں کے بیچ میں نالی کے پاس رام نرائن اور اس کی ماں اور اس کی بیوی کی لاشیں پڑی تھیں۔ سامنے لالہ بانشی رام کھتری کا مکان جل رہا تھا اور لوہے کے دروازے کے سامنے اس کی بیوی کی لاش پڑی تھی جس نے تیسری منزل سے چھلانگ لگائی تھی۔ سب گھر خاموش تھے۔ سب دکانیں بند تھیں۔ گلیاں سنسان تھیں اور بازار ویران۔ کہیں کہیں لیگ کے جھنڈے لگے ہوئے تھے۔ ہم

لوگوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر مختلف گلیوں میں بٹ کر اپنی اپنی جگہوں کی راہ لی۔ گلامتی گیٹ چلا گیا۔ بجا اکبری منڈی چلا گیا۔ میں اور رشید بھائی گیٹ کی طرف روانہ ہوئے جہاں داتا کے دربار کے عقب میں ہم نے اپنے بیوی بچوں کو رکھ چھوڑا تھا۔ چچا نورا ہی کے گھر میں۔

داتا کے دربار کے قریب مسلمانوں کا ایک بڑا ہجوم تھا اور اللہ اکبر کے نعرے بلند کر رہا تھا۔ پوچھنے پر پتہ چلا کہ کرشن نگر کے ہندوؤں کی مہاسبھائی ٹولی نے داتا کے دربار کی جانب عقب سے حملہ کیا اور آتے ہی آگ لگا دی۔ ہم لوگ بھاگے بھاگے اپنے گھر کی طرف دوڑے راستے میں چچا نورا بھی سر پیٹتے ہوئے ملے۔ بولے۔ ولئے بیٹا۔ غضب ہو گیا۔

"کیا ہوا چچا۔" میں نے گھبرا کر کہا۔

ہندوؤں نے ہمارے گھر کو آگ لگا دی۔ تیری چچی جل کے مر گئیں ہائے ہائے۔"

"اور میری بیوی" میں نے گھبرا کے پوچھا۔

"کافروں نے اسے جان سے مار ڈالا۔"

گھر راکھ کا ڈھیر تھا۔ ابھی آگ پوری طرح سے بجھی نہ تھی۔ دروازے پر میری بیوی کی لاش تھی۔ اس کا سر کسی نے کچل دیا تھا۔ میرا بڑا بیٹا داؤد سات برس کا داؤد۔ چاند سا ہمارا بیٹا داؤد اس کے قریب مردہ پڑا تھا۔ اس کی گردن میں ایک گہرا شگاف تھا۔

میں اپنے بچوں کے لئے کپڑے لایا تھا۔ اپنی بیوی کے لئے ماتھے کا جھومر اور بنارسی ساڑھیاں۔ میرے اللہ یہ کیا غضب ہے۔

میں نے چچا سے پوچھا اور میرا یعقوب تو سلامت ہے۔ کہہ دو چچا وہ تو سلامت ہے۔

چچا نورا بولے۔ اسے کافروں نے پہلے تو چھوڑ دیا تھا۔ پھر کسی نے کہا۔ یہ تو سانپ کا بچہ ہے۔ اس لئے انہوں نے اس پر بھی پیٹرول چھڑک دیا وہ ہے تمہارا یعقوب۔

کونے میں چند جلی ہوئی ہڈیاں اور خاکستر سر۔ چھوٹا سا۔ ننھا سا خاکستر سر! تم کیا سب مر گئے تھے چچا؟

محلے میں کوئی مرد نہیں تھا۔ نورا نے کہا۔ ہم لوگ سب لوٹ مار کے لئے گئے ہوئے تھے۔ کسے معلوم تھا بزدل ہماری غیر حاضری میں حملہ کریں گے اور وہ بھی یوں۔ نہتی عورتوں پر۔

میں نے ساڑھیاں اور زیور اور چاندی کا گلاس اپنی بیوی کی لاش کے سامنے رکھا اور اس سے کہا۔ مجھے تیری قسم ہے عائشہ اگر میں نے تیرے خون کا بدلہ نہ لیا ہو تو اپنے باپ کی نہیں کسی سور کی اولاد ہوں۔ اتنا کہہ کر میں نے چھرے کو ہاتھ میں پکڑا اور گلی کے باہر چلا گیا۔ رشید میرے ساتھ ہو لیا۔

اب کہاں جا رہے ہو پولیس آ رہی ہے۔ چچا چلایا۔

پولیس کی ماں کی اور پولیس کی بہن کی۔ میں اس وقت سیدھا شاہ عالمی جا رہا ہوں۔ کسی میں ہمت ہے تو مجھے روک لے۔ اللہ اکبر!

لال باغ

کملاکر کے جبڑے بڑے مضبوط تھے۔ اتنے مضبوط کہ رخسار کی ہڈی اور جبڑوں کے درمیان کے گوشت میں گڑھے پڑ گئے تھے۔ اس کا رنگ گورا تھا۔ قد پستہ۔ جسم گٹھا ہوا۔ آنکھوں میں بلی کی سی چمک اور مکاری پائی جاتی تھی۔ کملاکر کی عمر پچاس کے قریب ہو گی۔ لیکن دیکھنے میں وہ تیس کے اوپر نہیں۔ تیس سے کچھ کم کا ہی معلوم ہوتا تھا۔ کملاکر لال باغ کا معروف دادا تھا۔ بچپن میں اس نے جیب کترنے کا فن سیکھا تھا۔ دوچار بار جیل جا کر وہ بمبئی کی سب سے بڑی صنعت کا ایک معزز رکن بن گیا تھا۔ یوں تو بمبئی ایک کاروباری شہر ہے۔ صنعتی مرکز ہے۔ یہاں ملیں، فیکٹریاں، تجارتی گودام سب کچھ موجود ہیں۔ لیکن لوہا، کاٹن، تیل، کاغذ اور اناج کے کالے بیوپار سے بڑھ کر بھی جو صنعت یہاں کمال کو پہنچی ہوئی ہے وہ جرائم پیشہ لوگوں کا کاروبار ہے اس میں کروڑوں روپیوں کا لین دین ہوتا ہے اور مالابار ہل سے لے کر مدنپورہ کی جھونپڑیوں تک اس کے بھگتان کرنے والے پھیلے ہوئے ہیں۔ کملاکر اسی معزز صنعت کا ایک فرد تھا اور لال باغ میں دادا گیری کرتا تھا۔ دادا گیری آسان کام نہیں اور کرنے سے نہیں آتی۔ ہندوستان اور پاکستان کا گورنر جنرل بننا آسان ہے۔ لیکن لال باغ کا دادا بننا آساں نہیں۔ کملاکر نے یہ تاج پچاس برس کی کاوشوں کے بعد حاصل کیا تھا۔ بچپن میں وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ کارادر سے بمبئی آیا تھا۔ یہاں اس کے ماں باپ وکٹوریہ مل میں نوکر ہو گئے تھے اور وہ دن بھر گلیوں میں ہم عمر لڑکوں کے ساتھ کھیلتا رہتا۔ ٹراموں پر بغیر ٹکٹ لئے سوار ہوتا، میوہ فروشوں سے الجھتا، بوٹ

پالش کرنے والوں کو دھمکاتا' خوش پوش راہ گیروں سے بھیک مانگتا' پان والوں کی دوکانوں سے بیڑا اڑاتا اور اس طرح کے کئی ایک نیک کام کرتا کہ جن سے غریبوں کے بچوں کا مستقبل تعمیر ہوتا رہتا ہے۔ پھر ایک مہربان نے ترس کھا کر اسے جیب کترنے کا فن سکھا دیا اور اپنی دانست میں اسے راہ راست پر ڈال دیا۔ یہ راستہ اسے تین چار بار جیل لے گیا۔ پہلی بار جب وہ ریفارمیٹری اسکول گیا۔ تو اسے اپنا گاؤں یاد آیا۔ اسے چھوٹے چھوٹے مرغی کے چوزے یاد آئے جن سے وہ اپنے گھر کے آنگن میں کھیلا کرتا تھا۔ اسے وہ ندی کنارے جام کا پیڑ یاد آیا جہاں وہ حسین اور پری جمال گلہریوں کی اچھل کود سے محظوظ ہوا کرتا تھا۔ دوندے کی جھاڑیاں یاد آئیں' جو ندی کے کنارے اگ رہی تھیں اور جہاں اس نے ایک مرتبہ شاما کے گھونسلے میں تین نہایت نرم و نازک چتکبرے انڈوں کو دیکھا تھا۔ اس نے انڈے اپنی ہتھیلی میں اٹھا لئے اور دیر تک انہیں چھوتا رہا۔ پھر اس نے انڈے گھونسلے میں رکھ دیئے اور ایک خوبصورت تیتری کے پیچھے بھاگا۔ اس کے بھاگنے سے ایک خرگوش چوکنا ہو گیا اور اس کے سامنے سے لمبے لمبے کان کھڑے کئے تیر کی طرح بھاگا اور وہ وہیں کھڑا ہو کر ہنسنے لگا۔ تیتری فضا میں رنگ بھرتی جا رہی تھی۔ اس کے قہقہے گونج رہے تھے یکایک خرگوش دور جا کر کھڑا ہو گیا۔ اور حیرت سے مڑ کر اس کی طرف دیکھنے لگا کہ یہ لڑکا کیوں ہنس رہا ہے۔ پہلی بار کملاکر کو یہ سب کچھ یاد آیا۔ دوسری بار وہ ریفارمیٹری میں نہیں جیل میں لایا گیا۔ اب اسے بمبئی کی گلیاں یاد آئیں۔ بمبئی کے بازار اور مون سون کی بارش جب گرم گرم ابلی ہوئی نمکین مونگ پھلیاں چائے کے ساتھ کھانے میں مزا آتا ہے اور اس کے بعد پانچ شیر والی بیڑی' اسے فٹ بال کے میچ یاد آئے جو اس کے قریب ہی اینگلو انڈین کلب لال باغ میں ہوا کرتے تھے۔ کس قدر دلچسپی تھی اسے فٹ بال میں' زندگی بھر اس نے کبھی فٹ بال نہیں کھیلا تھا۔ وہ فٹ بال کو ہاتھ لگانا چاہتا تھا۔ یہ گول گول پھکنا جو دھماکے سے ہوا میں اڑتا ہے اور زمین پر اچھل کر پھر فضا میں پرواز کرتا ہے۔ دھم دھم ادھر دھم دھم ادھر۔ کملاکر چاہتا ایک ایسی کک لگائے کہ فٹ بال اوپر فضا میں دور میلوں تک اوپر چلا جائے۔ حتیٰ کہ کسی کو نظر بھی نہ

آئے۔ اور سب لوگ اسے حیرت سے تکنے لگیں۔ لیکن ایسا کبھی نہ ہوا۔ وہ تو صرف فٹ بال دیکھنے والے تماشائیوں کی جیبیں کاٹ سکتا تھا اور بس جیب کترنے کے لئے تین جگہیں سب سے عمدہ ہیں۔ ایک تو کھیل کا میدان جہاں تماشائیوں کو کھیل میں اتنی دلچسپی ہوتی ہے کہ وہ اپنی ساری سدھ بدھ بھول جاتے ہیں۔ دوسری سیاسی جلسہ' جہاں مقرر اپنی آتش بیانی سے لوگوں کے دلوں میں یعنی ہندوؤں کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف اور مسلمانوں کے دلوں میں ہندوؤں کے خلاف اور ہندوستانیوں کے دلوں میں انگریزوں کے خلاف آگ لگا دیتا ہے۔ کملاکر بھی سیاسی جلسوں میں جاتا تھا۔ اسے میٹھی' سنبھلی ہوئی' متین تقریریں پسند نہ تھیں۔ ایسے موقعوں پر لوگ جمائیاں لینے لگتے تھے اور اپنی جیبوں سے خبردار ہو جاتے تھے۔ وہاں ایسی تقریریں بہت کم ہوتی تھیں۔ یہی غنیمت تھا۔ نفرت کے جذبات لوگ بڑی خوشی سے قبول کرتے تھے۔ محبت رواداری' آشتی' صلح' امن کے جذبات لوگوں کو پسند نہ آتے تھے۔ اس لئے اچھے تقریر کرنے والوں کو اس نے کبھی اس غلطی کا مرتکب نہ پایا تھا۔ وہ اکثر سیاسی جلسوں میں جانے سے پہلے تقریر کرنے والے کا نام پوچھ لیا کرتا تھا۔ جب بھگو مل بگوانی چرخے کی افادی حیثیت پر تقریر کرنے کے لئے آتے تو وہ سمجھ جاتا کہ اب اس جلسے میں کسی کی جیب کاٹنا مشکل ہو گا۔ جب باجپئی پھنکار کر گرجدار آواز میں بمبئی کو سمیٹ کر مہاراشٹر میں شامل کرنے کی دھمکی دیتے اور بمبئی کے غیر مرہٹہ لوگوں کو پھنکارتے تو کملاکر سمجھتا کہ آج دو چار جیبیں ضرور کاٹی جائیں گی۔ اس لئے وہ ہمیشہ سوچ سمجھ کر کے سیاسی جلسوں میں شرکت کرتا تھا۔ ہاں ریلوے پلیٹ فارم پر وہ ضرور جاتا تھا۔ ہر روز دن میں دو تین بار۔ بالخصوص شام کے وقت جب لوگ گھروں کو لوٹتے' اسی جلدی' گھبراہٹ' بے چینی اور تابڑ توڑ گھر پہنچنے کی شدید خواہش میں جو اس مجمع میں ہوتی ہے اسے اپنا کام کرنے کا موقعہ مل ہی جاتا تھا۔ لیکن اب وہ اس پیشے سے کچھ بد دل سا ہو چلا تھا جس نے اسے دوبار جیل کی ہوا کھلائی تھی۔ اس لئے تیسری بار جب جیل میں آیا تو خوب چوکنا ہو کے' جیسے وہ کسی اسکول میں داخل ہو رہا ہو۔ اس نے دوسرے جرائم پیشہ قیدیوں سے راہ و رسم پیدا کی اور اب اسے معلوم

ہوا کہ اب تک وہ بسم اللہ کے گنبدی ہی میں بند تھا۔ بمبئی میں تو ایک سے ایک اونچا کاروبار پڑا ہے۔ جس میں لاکھوں روپے کا روز ہیر پھیر ہوتا ہے۔ یہ جیب کترنا بھی کوئی کاروبار ہے۔ آدمی کام کرے تو لڑکیوں کے بیچنے' لانے' لوانے' بکوانے کا کام کرے۔ احمد آباد سے چرس' افیم' بھنگ کی درآمد کرے۔ شراب کی بھٹی لگائے' کلیان میں بیٹھ کر کوکین سازی کرے۔ پھر چور بازار کے سودے ہیں۔ قمار خانے ہیں۔ بڑے بڑے لوگوں کی کمزوریوں سے واقف ہو کر انہیں لوٹنے کے بہانے ہیں۔ یہاں یہ جیب کترنا بھی کوئی کام ہے۔ پکڑے جاؤ تو پہلے تو لوگ پیٹتے ہیں۔ پھر پولیس پیٹتی ہے۔ پھر جیل کی چکی پیسنی ہے۔ تیسری بار تو کملاکر نے عہد کر لیا کہ اب وہ جیب کترنے کا دھندا نہیں کرے گا۔ تیسری بار جیل جانے کے بعد اس نے افیم اور چرس کی درآمد کا دھندا کیا اور اس میں اسے اور پولیس اور دوسرے لوگوں کو اتنا فائدہ ہوا کہ اس نے لال باغ کے دو چار بڑے بڑے سیٹھوں سے مل کر اپنی بھٹی رکھ لی اور بڑے پیانے پر تجارت کرنے لگا۔ اس کے بعد وہ کبھی جیل نہیں گیا۔ دو ایک بار پولیس نے اسے تڑی پار ضرور کر دیا تھا۔ لیکن سیٹھوں نے مل ملا کے اسے واپس بلوا لیا۔ اب اس کی عمر پچاس برس کی ہو گئی تھی۔ اس کا اپنا جوا خانہ تھا۔ شراب کی بھٹی تھی۔ افیم کا کاروبار تھا۔ ایک قحبہ خانہ تھا۔ ایک اپنا گھر تھا۔ موٹر تھی' بیوی تھی' چار بچے تھے' اس نے اپنے گاؤں میں اپنا گھر اینٹوں کا بنوایا تھا اور وہاں زمین بھی مول لی تھی۔ لال باغ میں ہر کوئی اس کی عزت کرتا۔ وہ جدھر سے گزرتا لوگ اس کی تعظیم کے لئے اٹھ جاتے اور پھر جھک جاتے اور پھر وہ ان کے سامنے سے گزر جاتا۔

آج بھی جب وہ کھانا کھا کے گھر سے نکلنے لگا تو کئی لوگ اس کی دید کے منتظر باہر کھڑے تھے' دست بستہ۔ اس نے کھانا کھا کر اپنی بیوی' اپنی چوتھی بیوی کے گال میں چٹکی لی اور تیزاب کی بوتل ہاتھ میں اٹھائے گھر سے نکلا۔ دروازے پر اس کا چھوٹا لڑکا راؤ کھڑا تھا۔ اس نے راؤ سے کہا۔ دادر کے ناکے کی طرف مت جانا جدھر رنجیت فلم کمپنی کا اسٹوڈیو ہے۔ اس علاقے کے مسلمان لڑکوں سے نہ کھیلا کرو۔ تجھے کتنی بار سمجھایا ہے۔ اب تو نہیں جائے گا۔ راؤ نے کان پکڑ کے کہا۔ اب کبھی نہیں جاؤں گا

دادا۔ راؤ بھی اپنے باپ کو دادا ہی کہتا تھا۔ کہ بچپن ہی سے وہ اپنے باپ کے متعلق ہر کس و ناکس سے یہی لفظ سنتا آیا تھا۔

راؤ کو فرمائش کرنے کے بعد اور تیزاب کی بوتل لے کر دادا کملاکر آگے بڑھا۔ اس کے چہیتے نائب شنکر نے تیزاب کی بوتل اپنے ہاتھ میں تھام لی' اور کملاکر اپنے گرگوں کے جلو میں لال باغ کے بڑے بازار میں آگیا۔ یہاں کل رات سے بہت گڑ بڑ تھی۔ گو بمبئی میں ہندو مسلم فساد ایک سال سے جاری تھا۔ لیکن کل رات سے جھگڑا بہت بڑھ گیا تھا۔ کملاکر فساد ہو جانے سے بہت خوش تھا۔ کیونکہ جب امن ہو جرم کا کاروبار ذرا ٹھنڈا پڑ جاتا ہے۔ پولیس بھی زیادہ ہوشیار ہو جاتی ہے اور فساد میں کسی کو یہ ہوش نہیں ہوتا کہ کل کا راشن کہاں سے آئے گا۔ چرس اور افیون کے کھیپ کون پکڑ سکتا ہے۔ دادا کملاکر کا کاروبار فساد کی وجہ سے بہت اچھا چل رہا تھا۔ سیٹھ پہلے سے زیادہ مہربان ہو گئے تھے۔ ان کی حفاظت کے لئے اس نے ہزاروں روپے ہتھیا لئے تھے اور سینکڑوں نوجوان ہندو چھوکروں کا پیٹ بھرتا تھا۔ دوسری صورت میں یہ شریف لڑکے ملوں میں ذلیل مزدوری کرتے اور صبح و شام رگڑتے ہوئے۔ اب تو چین تھا اور اچھا کھانا تھا اور جیب میں اعلیٰ سگریٹ اور رات کو شراب اور لڑکیاں اور لوگوں کے دلوں میں وہ ڈر جیسے ہٹلر کے صاحبزادے چلے جا رہے ہوں۔ یہ فساد زندگی بھر رہے تو کیا برا ہے۔

شنکر نے کملاکر کے کان میں کہا۔ رات کو چار مسلے گرائے۔

کملاکر نے اس کی پیٹھ ٹھونکی۔ شاباش۔ پھر رک کر کہا۔ "کون کون ہیں۔ وہ ابھی ان کی لاش اٹھوائی نہیں۔ چلئے دکھاتا ہوں۔"

وکٹوریہ مل کے ادھر ایک تنگ گلی میں جہاں کارپوریشن کے بھنگی غلاظت جمع کر کے رکھتے ہیں۔ وہاں ایک لڑکے کی لاش پڑی تھی۔ نیم برہنہ' کرتا پھٹا ہوا' آنتیں باہر نکلی ہوئیں۔ ہاتھ میں تیل کی شیشی۔ شاید گھر سے ماں نے بازار بھیجا تھا کہ سالن میں کڑی لگانے کے لئے تیل لے آئے۔

کیسے پہچانا۔

ششنکر نے اشارہ کر کے کہا۔

ختنے سے۔

شاباش! کملاکر نے کہا۔ یہ تیل کی شیشی لے لو۔ کسی غریب ہندو کے کام آ جائے گی۔

دوسرا موقعہ کون سا ہے۔ کملاکر نے پوچھا۔

وہ میرے علاقے میں ہے۔ بورکر نے آگے بڑھ کے اور اپنے استاد کو خوش کرنے کے لئے بتیسی نکالتے ہوئے کہا۔ بورکر کا ماتھا چھوٹا تھا۔ کان بڑے اور دانت باہر نکلے ہوئے۔ اس کی بانہیں سوکھی تھیں اور ہات بڑے بڑے اتنے بڑے کہ انہیں دیکھنے ہی سے ڈر معلوم ہوتا تھا۔ تنگ گلیوں سے گزرتے ہوئے وہ پریل کے جنوب میں کاردار اسٹوڈیو کے بہت آگے نکل گئے۔ جدھر ایک اکیلی سڑک ویرانے میں سے گزرتی ہوئی ڈاک یارڈ کی طرف جاتی تھی۔ یہاں ایک گڑھے میں ایک بڈھے کی لاش پڑی تھی۔ لاش سے معلوم ہوتا تھا جیسے یہ آدمی زندگی بھر زندہ نہ رہا ہو' ہونٹوں پر' ماتھے پر' آنکھوں کی پتلیوں میں' پیٹ پر' جسم کے ہر حصے میں اس مسلسل موت کے نشان تھے جو ہندوستان میں ایک غریب آدمی کے لئے پیدا ہوتے ہی شروع ہو جاتے ہیں اور روز بروز بڑھتے ہی جاتے ہیں۔ اس بڈھے کی زندگی ایک ایسی پرانی ہسٹری بوسیدہ کتاب تھی جس کے ہر صفحے پر بھوک' بے کاری' بیماری' قحط کی ہولناکیاں ثبت تھیں۔ یہ کتاب کیچڑ میں پڑی تھی۔ ایک گڑھے میں یہ زندگی جو ایک گڑھے میں شروع ہوئی اور ایک گڑھے میں ختم ہو گئی۔ یہ اکڑے اکڑے پاؤں جو ہمیشہ کیچڑ میں چلتے رہے۔ یہ ہونٹ جنہیں کبھی دو وقت کھانا نہیں ملا۔ یہ کان جنہوں نے کبھی اقبال کا نغمہ نہیں سنا۔ یہ آنکھیں جو سدا خوبصورتی سے آشنا رہیں۔ کیوں ایسی مسلسل موت کو لوگ زندگی کہتے ہیں۔

اور اب یہ لاش کملاکر کا انتظار کر رہی تھی۔

ارے یہ تو شیدو کی لاش ہے۔

شیدو بریلی کا رہنے والا تھا۔ بمبئی کے لال باغ میں تیس برس سے مونگ پھلی

بیچتا تھا۔ اتنا پرانا تھا وہ کہ ٹرام والے اور مزدور اور دکاندار اور منشی لوگ اور گجراتی سیٹھوں کے منیم اور سود خور پٹھان بھی اسے جانتے تھے۔ وہ اتنا پرانا تھا جیسے بس کا اسٹینڈ یا وکٹوریہ مل کی گھڑی۔ یا ایرانی کا ریسٹوران۔ لال باغ اس کے بغیر نامکمل تھا۔ مونگ پھلی بھوننے، تلنے اور اسے خوش اخلاقی سے بیچنے میں اسے کمال حاصل تھا۔ اس کی زندگی ہندوؤں کے ساتھ بسر ہوتی تھی۔ انہیں کے ساتھ اس نے اپنا لڑکپن، اپنی جوانی اور اپنا بڑھاپا بسر کیا تھا۔ اسی محلے میں اس کی شادی ہوئی تھی اور گجراتی سیٹھوں نے پانسو روپے سے اس کی مدد کی تھی۔ اسی علاقے میں اس کے بیوی بچے بے خوف و خطر گھومتے تھے۔ وہ لال باغ کی تخلیق تھے۔ اس کے ماحول کا حصہ تھے۔ اس کی خوشیوں، غموں کے وارث، وہ اسے چھوڑ کر کہا جا سکتے تھے۔ جب فساد شروع ہوا۔ تو بہتیرے مسلمانوں نے اس سے کہا کہ وہ لال باغ چھوڑ کر چلا جائے۔ لیکن شید نے ہنس کر ٹال دیا۔ میں اپنے بھائی ہندوؤں میں ہوں کوئی مجھے کیا کہے گا۔ ابھی دو روز ہوئے کملاکر نے بھی اس سے یہی کہا تھا۔ شیدو میاں ہم تو ان مسلمانوں کے خلاف ہیں جنہوں نے ہمارے دیس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے ہیں۔ تم تو اپنے آدمی ہو۔ تمہارا کوئی بال بیکا نہیں کر سکتا۔

کملاکر آگے بڑھ گیا۔ اس نے بورکر سے کہا۔ "ارے اسے کیوں مارا۔"

بورکر نے کہا۔ "کیا کرتا۔ اپنے علاقے میں اب یہی باقی رہا تھا اور مجھے پچاس روپوں کی ضرورت تھی۔"

کملاکر نے جیب سے پچاس روپے نکال کر اسے دیئے۔ سیٹھ اگلے ہفتے سے پچاس کے پچیس کرنے والے ہیں۔ کیونکہ سیٹھ بولتے تھے...... اب مسلمانوں کو مارنے والے بہتیرے آدمی مل رہے ہیں۔ میں نے کہا سیٹھ لال باغ میں دوسرے آدمی نہیں آ سکتے اور میرے آدمی تو ایک مسلمان کے مارنے کے پچاس روپیہ لیں گے۔

پچاس روپے۔ شیدو کا گھر، شیدو کی بیوی، شیدو کے بچے، پچاس روپے، پچاس روپے، بھنی ہوئی مونگ پھلی کا کرارا ذائقہ، بارش کی پھوار، شیدو کی ملائم آواز۔ مونگ پھلی لے لو..... پچاس روپے۔ ایک چھوٹا سا دیا۔ ایک چھوٹا سا ٹمٹماتا ہوا دیا۔

چار آنے میں صبح و شام کا کھانا۔ اللہ کا شکر بچوں کے بھولے بھالے چہرے' بیوی کی نرم مہربان مسکراہٹ' پچاس روپے۔ رات کے گرم لحاف میں فرش پر خاموشی سے سو جانا۔ بچوں کے سانسوں کی مدھم آوازیں۔ ننھے کے ملائم ہات شیدو کی داڑھی سے کھیلتے ہوئے کھیلتے کھیلتے باپ کی آغوش میں سو جاتے ہوئے...... پچاس روپے.....

کملاکر کے دماغ کے اندر کسی تہہ میں کہیں دور' گہری تہہ میں ایک لمحہ کے لئے ایک چبھن سی پیدا ہوئی۔ اور پھر لمحے دوسرے میں مر گئی۔ وہ آگے بڑھ گیا۔ صورت سنگھ نے کہا ہسپتال کے پیچھے مزدوروں کے جھونپڑے میں ادھر۔

سرکاری ہسپتال کے پیچھے کھلی زمین تھی اور تاڑ کے پیڑ تھے اور بہت عرصے سے ایک مارواڑی سوداگر اسے بیچنا چاہتا تھا۔ لیکن اس زمین کی قیمت روز بروز بڑھتی چلی جا رہی تھی اور وہ بے چارہ اس پریشانی میں تھا کہ اسے کب اور کیسے بیچے جب اس نے یہ زمین خریدی تھی اس نے دو روپے گز کے حساب سے لی تھی اور اب لوگ اس کے دس روپے گز دینے کے لئے تیار تھے۔ اس نے سوچا وہ اسے بیچ دے کہ دوسرے روز کسی دوسرے سوداگر نے گیارہ روپے گز کے حساب سے زمین خریدنے کی بولی دی۔ تیسرے روز بھاؤ بارہ روپیہ ہو گیا۔ بے چارہ مارواڑی بہت پریشان تھا کہ کیا کرے۔ متواتر چھ سال سے وہ اسے بیچنا چاہ رہا تھا اور اسی وجہ سے نہ بیچ سکتا تھا کہ لوگ اس کے دام زیادہ ہی لگاتے چلے جا رہے تھے' اس اثناء میں یہاں بلوچ خانہ بدوشوں کا قافلہ آ کے آباد ہو گیا۔ کشمیری مسلمان آئے جو لکڑیوں کے گودام پر کام کرتے تھے' ڈاک یارڈ روڈ پر اور پھر سود خوار پٹھان جو اپنے میلے واسکوٹ میں روپے سینے سے لگائے سو روپے پر سو روپے سود لینے کے لئے مزدوروں اور کلرکوں اور بے کار فلمی ادیبوں کی تلاش میں گھومتے تھے۔ اس قطعے میں خیمے لگے تھے اور چھپر اور کئی جگہ تو صرف درخت کے تنے سے تاڑ کے پتوں کی چھت لگا دی گئی تھی' کہ بارش میں بھیگنے سے بچ جائیں۔ فساد کے دوران میں یہ بستی آہستہ آہستہ خالی ہوتی گئی اور اب تو چند دنوں سے بالکل ہی خالی پڑی تھی۔

کملاکر نے پوچھا۔ دھورت سنگھ' ارے وہاں تو اب کوئی نہیں رہتا۔

دھورت سنگھ نے کہا۔ وہاں تو کوئی نہیں تھا۔ یہ دو کشمیری مسلمان آئے تھے۔ میاں بیوی' اپنے کسی رشتے دار کو پوچھتے ہوئے۔ مجھے لڑکوں نے بتایا میں نے کہا آؤ تمہیں ان سے ملا دوں۔ بس میں انہیں ادھر لے گیا اور وہیں انہیں ختم کر دیا..... چلئے ادھر تاڑ کے جھاڑ کی طرف......

دونوں نوجوان تھے' کپڑے میلے کچیلے' ہونٹوں پر حیرت اور ڈر' اور ایک ایسا انجان بھولپن جیسے اپنی موت کا یقین نہ آتا ہو۔ جیسے ان کی زندگیاں کہہ رہی ہوں' ہمیں یہاں مرنا نہیں ہے۔ ہم تو ولر سے آئے ہیں۔ ہم شہد' زعفران اور سپید برف کے دیس سے آئے ہیں۔ ہمارے گاؤں میں آج سیب کے پھول کھلے ہوئے ہیں اور مخملیں سبزے کا فرش ہے اور آڑوؤں کے سرخ پھولوں کے گچھے لٹک رہے ہیں۔ اور ناشپاتیوں کی شاخوں میں سبز چکنی چکنی پتیاں پھوٹ رہی ہیں اور جہلم کا شفاف پانی نیلے پتھروں سے پھسلتا ہوا گنگنا رہا ہے۔ ہمیں ہماری زندگیاں واپس دے دو۔ ہم یہاں نہیں رہیں گے۔ ہمارا دیش کشمیر ہے۔

لڑکی کی نازک گردن میں شہ رگ پر زخم تھا اور اس کے ماتھے پر کشمیر کی صبح رو رہی تھی اور اس کے ہونٹوں پر پرائے دیس کی اوس تھی اور اس کی نیلی آنکھوں کے جھرنے خاموش تھے اور اس کا ہات اپنے خاوند کے ہاتھ میں تھا اور کشمیر کا شہزادہ اپنے صدیوں کے چیتھڑوں میں لپٹا ہوا اپنی غربت اور نکبت اور یاس کے باوجود اس قتل گاہ کے خونیں تخت پر ایک عجب تمکنت سے سو رہا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ اپنی بیوی کے ہات میں تھا اور دوسرا اکڑا ہوا ہات ایک مجسم سوال بن کے فضا میں معلق تھا۔ اس کے جسم پر بہترے گھاؤ تھے۔ کیونکہ اس نے مدافعت کی کوشش کی تھی اور مرتے دم تک اپنی محبوبہ' اپنی بیوی' اپنی زندگی کی عزت کو بچانا چاہا تھا۔ ایک ناکام کوشش کے بعد کشمیر مر گیا تھا اور دھان کے کھیت سوکھ گئے تھے اور برف شرم سے اور خوف سے دھرتی میں سما گئی تھی اور وہ اکڑا ہوا ہات کہہ رہا تھا۔ ظالمو! تم نے مسلمانوں کو نہیں مارا ہے۔ تم نے انسان کو مارا ہے۔ تم نے ہندوستان کو مارا ہے۔ تم نے تاج محل فتح پوری سیکری اور شالا مار کو قتل کیا ہے۔ یہ اشوک کی لاش ہے۔ یہ اکبر کا کفن ہے۔

یہ پانچ ہزار سال پرانی تہذیب کا مردہ ہے۔ یہ مرد سیاست دان ہندو اور مسلمان یہ سائنتی جاگیردار۔ یہ فریبی سرمایہ دار کس کے خون سے اور کس کی بربادی سے اپنی حکومتوں کی تعمیر کر رہے ہیں۔

کملاکر نے ہنس کر کہا۔ بڑے ٹھاٹ سے آئے تھے اپنے کسی رشتہ دار سے ملنے کے لئے۔ معلوم نہیں تھا یہاں دادا کملاکر سے ملاقات ہو گی۔ کملاکر کے گرگے ہنسنے لگے۔

کچھ توقف کے بعد کملاکر نے جیب سے سو روپے کے نوٹ نکال کے دھورت سنگھ کو دیئے اور اس سے کہا۔ ان لاشوں کو ٹھکانے لگا دو۔

شام کے اخبار ہند میں کملاکر نے پڑھا۔ آج بمبئی میں بالکل امن رہا۔ آگری پاڑہ۔ گول پیٹھا۔ ڈونگری۔ کالبا دیوی۔ بھنڈی بازار کہیں کوئی واردات نہیں ہوئی۔ صرف لال باغ میں چاقو زنی کی چار وارداتیں ہوئی' باقی سب جگہ امن ہے۔

کملاکر نے مسکرا کر اخبار کو تہہ کر کے پان والے کو دے دیا اور اس سے کہا۔ ایک بنڈل شیر مارکہ بیڑی کا دے دو اور یہ ہے تمہاری کوکین!

امرتسر

آزادی سے پہلے

جلیانوالہ باغ میں ہزاروں کا مجمع تھا۔ اس مجمع میں ہندو بھی تھے سکھ بھی تھے اور مسلمان بھی۔ ہندو مسلمانوں سے اور مسلمان سکھوں سے الگ صاف پہچانے جا سکتے تھے۔ صورتیں الگ تھیں، مزاج الگ تھے، تہذیبیں الگ تھیں۔ مذہب الگ تھے۔ لیکن آج یہ سب لوگ جلیانوالہ باغ میں ایک ہی دل لے کے آئے تھے۔ اس دل میں ایک ہی جذبہ تھا اور اس جذبے کی تیز اور تند آنچ نے مختلف تمدن اور سماج ایک کر دیئے تھے۔ یوں میں انقلاب کی ایسی پیہم رو تھی کہ جس نے آس پاس کے ماحول کو بھی پرفساد بنا دیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس شہر کے بازاروں کا ہر پتھر اور اس کے مکانوں کی ہر ایک اینٹ اس خاموش جذبے کی گونج سے آشنا ہے اور اس لرزتی ہوئی دھڑکن سے نغمہ ریز ہے جو ہر لمحے کے ساتھ گویا کہتی جاتی ہے۔ آزادی، آزادی......

جلیانوالہ باغ میں ہزاروں کا مجمع تھا اور سبھی نہتے تھے اور سبھی آزادی کے پرستار تھے۔ ہاتھوں میں لاٹھیاں تھیں، ریوالور، برین گن نہ سٹین گن۔ ہینڈ گرینیڈ نہ تھے۔ دیسی یا ولایتی ساخت کے بم بھی نہ تھے۔ مگر پاس کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی نگاہوں کی گرمی کسی بھونچال کے قیامت خیز لاوے کی حدت کا پتہ دیتی تھی۔ سامراجی نوجوان کے پاس لوہے کے ہتھیار تھے۔ یہاں دل فولاد کے بن گئے تھے، اور روحوں میں ایسی پاکیزگی سما گئی تھی جو صرف اعلیٰ اور ارفع قربانی سے حاصل ہوتی ہے۔ پنجاب کے پانچوں دریاؤں کا پانی اور ان کے رومان، اور ان کا سچا عشق اور ان کی تاریخی بہادری آج ہر فرد بشر، بچے بوڑھے کے تمتماتے ہوئے رخساروں میں تھی۔ ایک ایسا اجلا اجلا غرور جو اسی وقت حاصل ہوتا ہے۔ جب قوم جوان ہو جاتی ہے اور سویا ہوا ملک بیدار

ہو جاتا ہے۔ جنہوں نے امرتسر کے یہ تیور دیکھے ہیں۔ وہ ان گرووٴں کے اس مقدس شہر کو کبھی نہیں بھلا سکتے۔

جلیانوالہ باغ میں ہزاروں کا مجمع تھا اور گولی بھی ہزاروں پر چلی' تینوں طرف سے راستہ بند تھا اور چوتھی طرف ایک طرف چھوٹا سا دروازہ تھا۔ یہ دروازہ جو زندگی سے موت کو جاتا تھا۔ ہزاروں نے خوشی خوشی جام شہادت پیا۔ آزادی کی خاطر' ہندو' مسلمانوں اور سکھوں نے مل کر اپنے سینوں کے خزانے لٹا دیئے اور پانچوں دریاؤں کی سرزمین میں ایک چھٹے دریا کا اضافہ کیا تھا۔ یہ ان کے ملے جلے خون کا دریا تھا۔ یہ ان کے لہو کی طوفانی ندی تھی۔ جو اپنی اٹدتی ہوئی لہروں کو لئے ہوئے اٹھی اور سامراجی قوتوں کو خس و خاشاک کی طرح بہا لے گئی۔ پنجاب نے سارے ملک کے لئے اپنے خون کی قربانی دی تھی اور اس وسیع آسمان تلے کسی نے آج تک مختلف تہذیبوں' مختلف مذہبوں اور مختلف مزاجوں کو ایک ہی جذبے کی خاطر یوں مدغم ہوتے نہ دیکھا تھا' جذبہ شہیدوں کے خون سے استوار ہو گیا تھا۔ اس میں رنگ آ گیا تھا' حسن' رعنائی اور تخلیق کی چمک سے جگمگا اٹھا.... آزادی..... آزادی...... آزادی۔

۲

صدیق کٹرہ فتح خاں میں رہتا تھا۔ کٹرہ فتح خاں میں اوم پرکاش بھی رہتا تھا جو امرتسر کے ایک مشہور بیوپاری کا بیٹا تھا۔ صدیق اسے اور اوم پرکاش صدیق کو بچپن سے جانتا تھا۔ وہ دونوں دوست نہ تھے کیونکہ صدیق کا باپ کچا چمڑہ بیچتا تھا اور غریب تھا۔ اور اوم پرکاش کا باپ بینکر تھا اور امیر تھا۔ لیکن دونوں ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ دونوں ہمسائے تھے اور آج دونوں جلیاں والا باغ میں اکٹھے ہو کر ایک ہی جگہ پر اپنے رہنماؤں کے خیالات اور ان کے تاثرات کو اپنے دل میں جگہ دے رہے تھے۔ کبھی کبھی وہ یوں ایک دوسرے کی طرف دیکھ لیتے اور یوں مسکرا اٹھتے۔ جیسے وہ سدا سے بچپن کے ساتھی ہیں اور ایک دوسرے کا بھید جانتے ہیں۔ دل کی بات نگاہوں میں نکھر آئی تھی۔ آزادی..... آزادی..... آزادی۔

اور جب گولی چلی تو پہلے اوم پرکاش کو لگی کندھے کے پار، اور وہ زمین پر گر

گیا۔ صدیق اسے دیکھنے کے لئے جھکا تو گولی اس کی ٹانگ کو چھیدتی ہوئی پار ہو گئی۔ پھر دوسری گولی آئی، پھر تیسری، پھر جیسے بارش ہوتی ہے۔ بس اسی طرح گولیاں برسنے لگیں اور خون بہنے لگا اور سکھوں کا خون مسلمانوں میں اور مسلمانوں کا خون ہندوؤں میں مدغم ہوتا گیا۔ ایک ہی گولی تھی ایک ہی قوت تھی، ایک ہی نگاہ تھی، جو سب دلوں کو چھیدتی چلی جا رہی تھی۔ صدیق اوم پرکاش پر اور بھی جھک گیا۔ اس نے اپنے جسم کو اوم پرکاش کے لئے ڈھال بنا لیا اور پھر وہ اوم پرکاش دونوں گولیوں کی بارش میں گھٹنوں کے بل گھسٹتے گھسٹتے اس دیوار کے پاس پہنچے جو اتنی اونچی نہ تھی کہ اسے کوئی پھلانگ نہ سکتا۔ لیکن اتنی اونچی ضرور تھی کہ اسے پھلانگتے ہوئے کسی سپاہی کی گولی کا خطرناک نشانہ بننا زیادہ مشکل نہ تھا۔

صدیق نے اپنے آپ کو دیوار کے ساتھ لگا دیا اور جانور کی طرح چاروں پنجے زمین پر ٹیک کر کہا۔ اوم پرکاش جی خدا کا نام لے کر دیوار پھلانگ جاؤ۔

گولیاں برس رہی تھی۔

اوم پرکاش نے بڑی مشکل سے صدیق کی پیٹھ کا سہارا لیا اور پھر اونچا ہو کر اس نے دیوار کو پھلانگنے کی کوشش کی۔

ایک گولی سنسناتی ہوئی آئی۔

جلدی کرو۔ صدیق نے نیچے سے کہا۔

لیکن اس سے پہلے پرکاش دوسری طرف جا چکا تھا۔ صدیق نے اسی طرح اکڑوں رہ کر ادھر ادھر دیکھا اور پھر یک لخت سیدھے ہو کر جو ایک جست لگائی تو دیوار کی دوسری طرف۔ لیکن دوسری طرف جاتے جاتے سنسناتی ہوئی گولی اس کی دوسری ٹانگ کے پار ہی ہو گئی۔

صدیق پرکاش کے اوپر جا گرا۔ پھر جلدی سے الگ ہو کر اسے اٹھانے لگا۔

تمہیں زیادہ چوٹ تو نہیں آئی پرکاش۔

لیکن پرکاش مرا پڑا تھا۔ اس کے ہات میں ہیرے کی انگوٹھی ابھی زندہ تھی۔ اس کی جیب میں دو ہزار کے نوٹ کلبلا رہے تھے، اس کا گرم خون ابھی تک زمین کو

سیراب کئے جا رہا تھا۔ حرکت تھی' زندگی تھی' اضطراب تھا' لیکن وہ خود مر چکا تھا۔ صدیق نے اسے اٹھایا اور اسے گھر لے چلا۔ اس کی دونوں ٹانگوں میں درد شدت کا تھا۔ لہو بہہ رہا تھا۔ ہیرے کی انگوٹھی نے بہت کچھ کہا سنا۔ لوگوں نے بہت کچھ سمجھایا۔ وہ تہذیب جو مختلف تھی۔ وہ مذہب جو الگ تھا۔ وہ سوچ جو بیگانہ تھا۔ اس نے طنز و تشنیع سے بھی کام لیا۔ لیکن صدیق نے کسی کی نہ سنی اور اپنے بہتے ہوئے لہو اور اپنی نکلتی ہوئی زندگی کی فریاد بھی نہ سنی اور اپنے راستے پر چلتا گیا۔ یہ راستہ بالکل نیا تھا۔ گو کٹرہ فتح خاں ہی کو جاتا تھا۔ آج فرشتے اس کے ہمراہ تھے۔ گو وہ ایک کافر کو اپنے کندھے پر اٹھائے ہوئے تھا۔ آج اس کی روح اس قدر امیر تھی کہ کٹرہ فتح پہنچ کر اس نے سب سے کہا۔ یہ لو ہیرے کی انگوٹھی گا اور یہ لو دو ہزار کے نوٹ اور یہ ہے شہید کی لاش اتنا کہہ کر صدیق بھی وہیں گر گیا اور شہر والوں نے دونوں کا جنازہ اس دھوم دھام سے اٹھایا گویا وہ سگے بھائی تھے۔

۳

ابھی کرفیو نہ ہوا تھا۔ کوچہ رام داس دو مسلمان عورتیں ایک سکھ عورت اور ایک ہندو عورت سبزی خریدنے آئیں۔ وہ مقدس گوردوارے کے سامنے سے گزریں۔ ہر ایک نے تعظیم دی اور پھر منہ پھیر کر سبزی خریدنے میں مصروف ہو گئیں۔ انہیں بہت جلد لوٹنا تھا۔ کرفیو ہونے والا تھا اور فضا میں شہید کے خون کی پکار گونج رہی تھی۔ پھر بھی باتیں کرتے اور سودا خریدتے انہیں دیر ہو گئی' اور جب وہ واپس چلنے لگیں تو کرفیو میں چند منٹ ہی باقی تھے۔

بیگم نے کہا۔ آؤ اس گلی سے نکل چلیں۔ وقت سے پہنچ جائیں گی۔

پارو نے کہا۔ پر وہاں تو پہرہ ہے گوروں کا۔

شام کور بولی۔ اور گوروں کا کوئی بھروسہ نہیں۔

زینب نے کہا۔ وہ عورتوں کو کچھ نہ کہیں گے۔ ہم گھونگھٹ کاڑھے نکل جائیں گی۔ جلدی سے چلو۔

وہ پانچوں دوسری گلی سے ہو لیں۔ فوجیوں نے کہا۔ اس جھنڈے کو سلام کرو۔ یہ

یونین جیک ہے۔

عورتوں نے گھبرا کر اور بوکھلا کر سلام کیا۔

اب یہاں سے وہاں تک۔ فوجی نے گلی کی لمبائی بتاتے ہوئے کہا۔ گھٹنوں کے بل چلتی ہوئی یہاں سے فی الفور نکل جاؤ۔

گھٹنوں کے بل۔ یہ تو ہم سے نہ ہو گا۔ زینب نے چمک کر کہا۔

اور جھک کر چلو..... سرکار کا حکم ہے۔ گھٹنوں کے بل گھسٹ کر چلو۔

ہم تو یوں جائیں گے۔ شام کور نے تن کر کہا۔ دیکھیں کون روکتا ہے ہمیں۔ یہ کہہ کر وہ چلی۔

ٹھہرو۔ ٹھہرو۔ پارو نے ڈر کر کہا۔

ٹھہرو۔ ٹھہرو۔ گورے نے کہا۔ ہم گولی مارے گا۔

شام کور سیدھی جا رہی تھی۔

ٹھائیں۔

شام کور گر گئی۔

زینب اور بیگم نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر وہ دونوں گھٹنوں کے بل گر گئیں۔ گورا خوش ہو گیا۔ اس نے سمجھا سرکار کا حکم بجا لا رہی ہیں۔

زینب اور بیگم نے گھٹنوں کے بل گر کر اپنے دونوں ہات اوپر اٹھائے اور چند لمحوں کے سکوت کے بعد وہ دونوں سیدھی کھڑی ہو گئیں اور گلی کو پار کرنے لگیں۔

گورا بھونچکا رہ گیا۔ پھر غصے سے اس کے گال تمتما اٹھے اور اس نے رائفل سیدھی کی۔

ٹھائیں۔ ٹھائیں۔

پارو رونے لگی۔ اب مجھے بھی مرنا ہو گا۔ یہ کیا مصیبت ہے میرے پتی دیو۔ میرے بچو۔ میرے ماں جی۔ میرے پتا جی۔ میرے ویرو' مجھے شما کرنا۔ آج بھی مجھے مرنا ہو گا۔ میں مرنا نہیں چاہتی۔ پھر مجھے بھی مرنا ہو گا۔ میں اپنی بہنوں کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتی۔

پارو روتے روتے آگے بڑھی۔

گورے نے نرمی سے اسے سمجھایا۔ "رونے کی ضرورت نہیں سرکار کا حکم مانو اور اس گلی سے یوں گھٹنوں کے بل گر کر چلتی جاؤ۔ پھر تمہیں کوئی کچھ نہ کہے گا۔" گورے نے خود گھٹنے پر گر کر اسے چلنے کا انداز سمجھایا۔

پارو روتے روتے گورے کے قریب آئی۔ گورا اب سیدھا تن کر کھڑا تھا۔ پارو نے زور سے اس کے منہ پر تھوک دیا اور پھر پلٹ کر گلی کو پار کرنے لگی۔ وہ گلی کے بیچوں بیچ سیدھی تن کر چلی جا رہی تھی اور گورا اس کی طرف حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ چند لمحوں کے بعد اس نے اپنی بندوق سیدھی کی اور پارو جو اپنی سہیلیوں میں سب سے زیادہ کمزور اور بزدل تھی سب سے آگے جا کر مر گئی۔

پارو، زینب، بیگم، شام کور۔

گھر کی عورتیں، پردے دار خواتین، عفت ماب بیبیاں، اپنے سینوں میں اپنے خاوند کا پیار اور اپنے بچوں کی ممتا کا دودھ لئے ظلم کی اندھیری گلی سے گزر گئیں۔ ان کے جسم گولیوں سے چھلنی ہو گئے لیکن ان کے قدم نہیں ڈگمگائے۔ اس وقت کسی کی محبت نے پکارا ہو گا۔ کسی نے ننھے بازوؤں کا بلاوا آیا ہو گا۔ کسی کی سیانی مسکراہٹ دکھائی دی ہو گی۔ لیکن ان کی روحوں نے کہا۔ نہیں آج تمہیں جھکنا نہیں ہے، آج صدیوں کے بعد وہ لمحہ آیا ہے۔ جب سارا ہندوستان جاگ اٹھا ہے اور سیدھا تن کر اس گلی سے گزر رہا ہے۔ سر اٹھائے آگے بڑھ اٹھائے، سر اٹھائے آگے بڑھ رہا ہے۔ زینب بیگم، پارو، شام کور.... کس نے کہا۔ اس ملک سے سیتا مر گئی؟ کس نے کہا اب اس دیس میں ستی ساوتری پیدا نہیں ہوتی؟..... آج اس گلی کا ذرہ ذرہ کسی کے قدسی لہو سے روشن ہے۔ شام کور، زینب، پارو، بیگم، آج تم خود اس گلی سے سر اونچا کر کے نہیں گزری ہو۔ آج تمہارا دیس فخر سے سر اٹھائے اس گلی سے گزر رہا ہے۔ آج آزادی کا اونچا جھنڈا اس گلی سے گزر رہا ہے۔ آج تمہارے دیس، تمہاری تہذیب، تمہارے مذہب کی قابل احترام روائتیں زندہ ہو گئی ہیں۔ آج انسانیت کا سر غرور سے بلند ہے، تمہاری روحوں پر ہزاروں، لاکھوں سلام....

امرتسر آزادی کے بعد

پندرہ اگست ۱۹۴۷ عیسوی کو ہندوستان آزاد ہوا۔ پاکستان آزاد ہوا۔ پندرہ اگست ۱۹۴۷ عیسوی کو ہندستان بھر میں جشن آزادی منایا جا رہا تھا اور کراچی میں آزاد پاکستان فرحت ناک نعرے بلند ہو رہے تھے۔ پندرہ اگست۔ پندرہ اگست ۱۹۴۷ء کو لاہور جل رہا تھا اور امرتسر میں ہندو مسلم سکھ عوام فرقہ وارانہ فساد کی ہولناک لپیٹ میں آ چکے تھے۔ کیونکہ کسی نے پنجاب کے عوام سے نہیں پوچھا تھا کہ تم الگ رہنا چاہتے ہو یا مل جل کے جیسا تم صدیوں سے رہتے چلے آئے ہو، صدیوں پہلے، مطلق العنانی کا دور دورہ تھا اور کسی نے عوام سے کبھی نہ پوچھا تھا۔ پھر انگریزوں نے اپنے سامراج کی بنیاد ڈالی اور انہوں نے پنجاب سے سپاہی اور گھوڑے اپنی فوج میں بھرتی کئے اور اس کے عوض پنجاب کو نہریں، پنشنیں عطا فرمائیں۔ لیکن انہوں نے بھی پنجابی عوام سے یہ سب کچھ پوچھ کے تھوڑی کیا تھا۔ اس کے بعد سیاسی شعور آیا اور سیاسی شعور کے ساتھ جمہوریت آئی اور جمہوریت کے ساتھ جمہوری سیاست دان آئے اور سیاسی جماعتیں آئیں۔ لیکن فیصلہ کرتے وقت انہوں نے بھی پنجابی عوام سے کچھ نہ پوچھا۔ ایک نقشہ سامنے رکھ کر پنجاب کی سرزمین کے نوک قلم سے دو ٹکڑے کر دیئے۔ فیصلہ کرنے والے سیاست دان گجراتی تھے، کشمیری تھے، اس لئے پنجاب کے نقشے کو سامنے رکھ کے اس پر قلم سے ایک لکیر۔ ایک حد فاصل قائم کر دینا ان کے لئے زیادہ مشکل نہ تھا۔ نقشہ ایک نہایت ہی معمولی سی چیز ہے۔ آٹھ آنے روپے میں پنجاب کا نقشہ ملتا ہے اس پر لکیر کھینچ دینا بھی آسان ہے۔ ایک کاغذ کا ٹکڑا۔ ایک روشنائی کی لکیر وہ

کیسے پنجاب کے دکھ کو سمجھ سکتے تھے۔ اس لکیر کی ماہیت کو جو اس نقشے کو نہیں پنجاب کے دل کو چیرتی جا رہی تھی، پنجاب کے تین مذہب تھے، لیکن اس کا دل ایک تھا۔ اس کا لباس ایک تھا۔ اس کی زبان ایک تھی، اس کے گیت ایک تھے۔ اس کے کھیت ایک تھے، اس کے کھیتوں کی رومانی فضا اور اس کے کسانوں کے پنچائتی ولولے ایک تھے، پنجاب میں وہ سب باتیں موجود تھی جو ایک تہذیب، ایک دیس، ایک قومیت کے وجود کا احاطہ کرتی ہیں۔ پھر کس لئے اس کے گلے پر چھری چلائی گئی؟ کس لئے اس کی رگوں میں سالہا سال کی نفرت کا بیج بو دیا گیا۔ کس لئے اس کے کھلیانوں کو شیطنت اور ظلم اور مذہبی بہمیت کی آگ سے جلایا گیا؟ ہمیں معلوم نہ تھا۔ "ہمیں بڑا افسوس ہے۔" ہم اس ظلم کی مذمت کرتے ہیں ظلم اور نفرت اور مذہبی جنون کو بھڑکانے والے پنجاب کی وحدت کو مٹا دینے والے آج مگر مچھ کے آنسو بہا رہے ہیں اور آج پنجاب کے بیٹے دلی کی گلیوں میں اور کراچی کے بازاروں میں بھیک مانگ رہے ہیں اور ان کی عورتوں کی عصمت لٹ چکی ہے اور ان کے کھیت ویران پڑے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ہندستان اور پاکستان کی حکومتوں نے آج تک پنجابی بناگزینوں کے لئے بیس کروڑ روپے صرف کئے ہیں یعنی فی کس بیس روپے۔ بڑا احسان کیا ہے ہماری سات پشتوں پر۔ ارے ہم نو مہینے میں بیس روپے کی لسی پی جاتے ہیں اور آج تم ان لوگوں کو خیرات دینے چلے ہو۔ جو کل تک ہندوستان کے سب کسانوں میں سے زیادہ خوشحال تھے۔ جمہوریت کے پرستارو ذرا پنجاب کے کسانوں سے، اس کے طالب علموں سے، اس کے کھیت کے مزدوروں سے۔ اس کے دکان داروں سے۔ اس کی ماؤں، بیٹیوں، بہوؤں ہی سے پوچھ تو لیا ہوتا کہ اس نقشے پر جو کالی لکیر لگ رہی ہے، اس کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟ مگر وہاں فکر کس کو ہوتی کسی کا اپنا دیس ہوتا، کسی کا اپنا وطن ہوتا، کسی کی اپنی زبان ہوتی۔ کسی کے اپنے گیت ہوتے تو وہ سمجھ سکا کہ یہ غلطی کیا ہے اور اس کا خمیازہ کسے بھگتنا پڑے گا۔ یہ دکھ وہی سمجھ سکتا ہے جو ہیر کو رانجھے سے جدا ہوتے ہوئے دیکھے۔ جو سوہنی کو مہینوال کے فراق میں تڑپتا دیکھے۔ جس نے پنجاب کے کھیتوں میں اپنے ہاتھوں سے گیہوں کی سبز بالیاں اگائی ہوں اور اس کے

کپاس کے پھولوں کے ننھے چاندوں کو چمکتا ہوا دیکھا ہو' یہ سیاست داں کیا سمجھ سکتے اس دکھ کو۔ جمہوریت کے سیاست دان تھے نا۔

خیر یہ رونا مرنا ہوتا رہتا ہے۔ انسان کو ابھی انسان ہونے میں بہت دیر ہے اور پھر ایک ہیمدان افسانہ نگار کو ان باتوں سے کیا۔ اسے زندگی سے' سیاست سے' علم و فن سے' سائنس سے' تاریخ و فلسفے سے کیا لگاؤ' اسے کیا غرض کہ پنجاب مرتا ہے یا جیتا ہے۔ عورتوں کی عصمتیں برباد ہوتی ہیں یا محفوظ رہتی ہیں۔ بچوں کے گلے پر چھری پھیری جاتی ہے یا ان پر مہربان ہونٹوں کے بوسے ثبت ہوتے ہیں۔ اسے ان سب باتوں سے الگ ہو کر کہانی سنانی چاہئے' اپنی چھوٹی موٹی کہانی۔ جو لوگوں کے دلوں کو خوش کر سکے۔ یہ بڑے بول اسے زیب نہیں دیتے۔

ٹھیک تو کہتے ہیں آپ' اس لئے اب امرتسر کی آزادی کی کہانی سنئے۔ اس شہر کی کہانی جہاں جلیاں والا باغ ہے' جہاں شمالی ہند کی سب سے بڑی تجارتی منڈی ہے۔ جہاں سکھوں کا سب سے بڑا متقدس ترین گردوارہ ہے جہاں کی قومی تحریکوں میں مسلمان' ہندوؤں اور سکھوں نے ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے۔ کون جانتا ہے کہ لاہور اگر فرقے داری کا قلعہ ہے تو امرتسر قومیت کا مرکز ہے۔ اسی قومیت کے بڑے مرکز کی داستان سنئے۔

پندرہ اگست ۱۹۴۷ء کو امرتسر آزاد ہوا۔ پڑوس میں لاہور جل رہا تھا مگر امرتسر آزاد تھا اور اس کے مکانوں' دکانوں' بازاروں پر ترنگے جھنڈے لہرا رہے تھے' امرتسر کے قوم پرست مسلمان اس جشن آزادی میں سب سے آگے تھے' کیونکہ وہ آزادی کی تحریک میں سب سے آگے رہے تھے یہ امرتسر اکالی تحریک ہی کا امرتسر نہ تھا۔ یہ احراری تحریک کا بھی امرتسر تھا۔ یہ ڈاکٹر ستیہ پال کا امرتسر نہ تھا۔ یہ کچلو اور حسام الدین کا امرتسر تھا۔ اور آج امرتسر آزاد تھا اور اس کی قوم پرور فضا میں آزاد ہندستان کے نعرے گونج رہے تھے اور امرتسر کے مسلمان اور ہندو سکھ یک جا خوش تھے۔ جلیاں والا باغ کے شہید زندہ ہو گئے تھے۔

شام کو جب اسٹیشن پر چراغاں ہوا تو آزاد ہندستان اور آزاد پاکستان سے دو

اسپیشل گاڑیاں آئیں۔پاکستان سے آنے والی گاڑی میں ہندو اور سکھ لوگ تھے ہندستان سے آنے والی گاڑی میں مسلمان تھے۔ تین چار ہزار افراد اس گاڑی میں اور اتنے ہی دوسری گاڑی میں۔ کل چھ سات ہزار افراد میں بمشکل دو ہزار زندہ ہوں گے۔ باقی لوگ مرے پڑے تھے اور ان کی لاشیں سربریدہ تھیں اور ان کے سر نیزوں پر لگا کے گاڑیوں کی کھڑکیوں میں سجائے گئے تھے' پاکستان اسپیشل پر اردو کے موٹے موٹے حروف میں لکھا ہوا تھا۔ "قتل کرنا پاکستان سے سیکھو۔" ہندوستان اسپیشل پر لکھا تھا ہندی میں "بدلہ لینا ہندستان سے سیکھو" اس پر ہندوؤں اور سکھوں کو بڑا طیش آیا۔ ظالموں نے ہمارے بھائیوں کے ساتھ کتنا برا سلوک کیا ہے' ہائے یہ ہمارے ہندو اور سکھ پناہ گزیں اور واقعی ان کی حالت بھی قابل رحم تھی انہیں فوراً گاڑی سے نکال کر پناہ گزینوں کے کیمپ میں پہنچایا گیا اور سکھوں اور ہندوؤں نے مسلمانوں گاڑی پر دھاوا بول دیا یعنی اگر نہتے نیم مردہ مہاجرین پر حملے کرنے کو "دھاوا" کہہ سکتے ہیں۔ تو واقعی یہ دھاوا تھا۔ آدھے سے زیادہ لوگ مار ڈالے گئے' جب کہیں جا کر ملٹری نے حالات پر قابو پایا۔

گاڑی میں ایک بڑھیا عورت بیٹھی تھی اور اس کی گود میں اس کا ننھا پوتا تھا راستے میں اس کا بیٹا مارا گیا۔ اس کی بہو کو جاٹ اٹھا کر لے گئے تھے۔ اس کے خاوند کو لوگوں نے بھالوں سے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تھا۔ اب وہ چپ چاپ بیٹھی تھی۔ اس کے لبوں پر آہیں نہ تھیں' اس کی آنکھوں میں آنسو نہ تھے اس کے دل میں دعا نہ تھی' اس کے ایمان میں قوت نہ تھی' وہ پتھر کا بت بنی چپ چاپ بیٹھی تھی' جیسے وہ کچھ سن نہ سکتی تھی' کچھ نہ دیکھ سکتی تھی' کچھ محسوس نہ کر سکتی تھی۔

بچے نے کہا۔ "دادی اماں پانی۔"

دادی چپ رہی۔

بچہ چیخا۔ "دادی اماں پانی۔"

دادی نے کہا۔ "بیٹا پاکستان آئے گا تو پانی ملے گا؟"

بچے نے کہا۔ "دادی اماں کیا ہندستان میں پانی نہیں ہے؟"

دادی نے کہا۔ "بیٹا اب ہمارے دیس میں پانی نہیں ہے۔"

بچے نے کہا۔ "کیوں نہیں ہے؟ مجھے پیاس لگی ہے۔ میں تو پانی پیوں گا۔ پانی' پانی' پانی۔ دادی اماں پانی پیوں گا۔ میں پانی پیوں گا۔"

"پانی پیو گے؟" ایک اکالی رضا کار وہاں سے گزر رہا تھا۔ اس نے خشمگیں نگاہوں سے بچے کی طرف دیکھ کے کہا۔

"پانی پیو گے نا؟"

"ہاں بچے نے سر ہلایا۔"

"نہیں' نہیں۔" دادی نے خوفزدہ ہو کے کہا۔ "یہ کچھ نہیں کہتا آپ کو' یہ کچھ نہیں مانگتا آپ سے' خدا کے لئے سردار صاحب اسے چھوڑ دیجئے۔ میرے پاس اب کچھ نہیں ہے۔

اکالی رضاکار ہنسا۔ اس نے پائیدان سے رستے ہوئے خون کو اپنی اوک میں جمع کیا اور اسے بچے کے قریب لے جا کے کہنے لگا۔

"لو پیاس لگی ہے۔ تو یہ پی لو' بڑا اچھا خون ہے۔ مسلمان کا خون ہے۔"

دادی پیچھے ہٹ گئی۔ بچہ رونے لگا۔ دادی نے بچے کو اپنے پیلے دوپٹے سے ڈھک لیا اور اکالی رضاکار ہنستا ہوا آگے چلا گیا۔ دادی سوچنے لگی' کب یہ گاڑی چلے گی۔ میرے اللہ پاکستان کب آئے گا۔

ایک ہندو پانی کا گلاس لے کر آیا۔ "لو پانی پلا دو اسے۔"

لڑکے نے اپنی بانہیں آگے بڑھائیں۔ اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ اس کی آنکھیں باہر نکلی پڑتی تھیں۔ اس کے جسم کا رواں رواں پانی مانگ رہا تھا۔

ہندو نے گلاس ذرا پیچھے سرکا لیا۔ بولا۔ اس پانی کی قیمت ہے۔ مسلمان بچے کو پانی مفت نہیں ملتا۔ اس گلاس کی قیمت پچاس روپے ہے۔"

"پچاس روپے۔" دادی نے عاجزی سے کہا۔ "بیٹا میرے پاس تو چاندی کا ایک چھلا بھی نہیں ہے۔ میں پچاس روپے کہاں سے دوں گی۔"

"پانی' پانی' تو پانی مجھے دو۔ پانی کا گلاس مجھے دے دو۔ دادی اماں دیکھو۔ یہ ہمیں

پانی پینے نہیں دیتا۔"

"مجھے دو' مجھے دو" ایک دوسرے مسافر نے کہا۔ "تو میرے پاس پچاس روپے ہیں۔"

ہندو ہنسنے لگا۔ "یہ پچاس روپے تو بچے کے لئے تھے' تمہارے لئے اس گلاس کی قیمت سو روپیہ ہے۔ سو روپے دو اور یہ پانی کا گلاس پی لو۔"

اچھا۔ یہ سو روپیہ ہی لے لو۔ یہ لو۔"

دوسرے مسلمان مسافر نے سو روپیہ ادا کر کے گلاس لے لیا اور اسے غٹا غٹ پینے لگا۔

بچہ اسے دیکھ کے اور بھی چلانے لگا۔ پانی' پانی' پانی۔ دادی اماں پانی۔

"ایک گھونٹ اسے بھی دو' خدا اور رسول کے لئے۔"

مسلمان' کافر نے گلاس خالی کر کے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ گلاس اس کے ہات سے چھوٹ کر فرش پر جا گرا' اور پانی کی چند بوندیں فرش پر بکھر گئیں۔

بچہ گود سے اتر کر فرش پر چلا گیا۔ پہلے اس نے خالی گلاس کو چاٹنے کی کوشش کی۔ پھر فرش پر گری ہوئی چند بوندوں کو' پھر زور' زور سے چلانے لگا۔ "پانی۔ دادی اماں پانی۔ پانی۔"

پانی موجود تھا اور پانی نہیں تھا۔ ہندو پناہ گزین پانی پی رہے تھے اور مسلمان پناہ گزین پیاسے تھے۔ پانی موجود تھا اور مٹکوں کی قطاریں اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر سجی ہوئی تھیں اور پانی کے نل کھلے تھے اور بھنگی آبدست کے لئے پانی ہندو مسافروں کو دے رہے تھے۔ لیکن پانی نہیں تھا تو مسلمان مہاجرین کے لئے۔ کیونکہ پنجاب کے نقشے پر ایک کالی موت کی لکیر کھینچ گئی تھی اور کل کا بھائی آج دشمن ہو گیا تھا۔ اور کل جس کو ہم نے بہن کہا تھا وہ آج ہمارے لئے طوائف سے بھی بدتر تھی اور کل جو ماں تھی آج بیٹے نے اس کو ڈائن سمجھ کر اس کے گلے پر چھری پھیر دی تھی۔ پانی ہندستان میں تھا اور پانی پاکستان میں بھی تھا۔ لیکن پانی کہیں نہیں تھا۔ کیونکہ آنکھوں کا پانی مر گیا تھا اور یہ دونوں ملک نفرت کے صحرا بن گئے تھے۔ اور ان کی تپتی ہوئی

ریت پر چلتے ہوئے کارواں بادسموم کی بربادیوں کے شکار ہو گئے تھے۔ پانی تھا۔ مگر سراب تھا جس دیس میں لسی اور دودھ پانی کی طرح بہتے تھے، وہاں آج پانی نہیں تھا اور اس کے بیٹے پاس سے بلک بلک کر مر رہے تھے، لیکن دل کے دریا سوکھ گئے تھے، اس لئے پانی تھا اور نہیں بھی تھا۔

پھر آزادی کی رات آئی۔ دیوالی پر بھی ایسا چراغاں نہیں ہوتا۔ کیونکہ دیوالی پر تو صرف دیئے جلتے ہیں۔ یہاں گھروں کے گھر جل رہے تھے۔ دیوالی پر آتش بازی ہوتی ہے۔ پٹاخے چھوٹتے ہیں۔ یہاں بم پھٹ رہے تھے اور مشین گنیں چل رہی تھیں۔ انگریزوں کے راج میں ایک پستول بھی بھولے سے کہیں نہیں ملتا تھا اور آزادی کی پہلی ہی رات نہ جانے کہاں سے یہ اتنے سارے بم، ہینڈ گری نیڈ مشین گن، اسٹین گن، برین گن، ٹپک پڑے۔ یہ اسلحہ جات برطانوی اور امریکی کمپنیوں کے بنائے ہوئے تھے اور آج آزادی کی رات ہندستانیوں کے دل چھید رہے تھے۔ لڑے جاؤ، بہادرو۔ مرے جاؤ بہادرو۔ ہم اسلحہ جات تیار کریں گے تم لوگ لڑو گے، شاباش بہادرو۔ دیکھنا کہیں ہمارے گولہ بارود کے کارخانوں کا منافع کم نہ ہو جائے۔ گھمسان کا رن رہے تو مزا ہے۔ چین والے لڑتے ہیں۔ تو ہندوستان اور پاکستان والے کیوں نہ لڑیں۔ وہ بھی ایشیائی ہیں۔ تم بھی ایشیائی ہو۔ ایشیا کی عزت برقرار رکھو۔ لڑتے جاؤ بہادرو۔ تم نے لڑنا بند کر دیا تو ایشیا کا رخ دوسری طرف پلٹ جائے گا اور پھر ہمارے کارخانوں کے منافعے اور حصے ہماری سامراجی خوشحالی خطرے میں پڑ جائے گی۔ لڑے جاؤ بہادرو۔ پہلے تم ہمارے ملکوں سے کپڑا اور شیشے کا سامان اور عطریات منگاتے تھے، اب ہم تمہیں اسلحہ جات بھیجیں گے اور بم اور ہوائی جہاز اور کارتوں کیونکہ اب تم آزاد ہو گئے ہو۔

مسلح ہندو اور سکھ رضا کار مسلمانوں کے گھروں کو آگ لگا رہے تھے اور جے ہند کے نعرے گونج رہے تھے۔ مسلمان اپنے گھروں کی کمین گاہوں میں چھپ کر حملہ آوروں پر مشین گنوں سے حملہ کر رہے تھے اور ہینڈ گری نیڈ پھینکتے تھے۔

آزادی کی رات اور اس کے تین چار روز بعد تک اس طرح مقابلہ رہا پھر

سکھوں اور ہندوؤں کی مدد کے لئے آس پاس کی ریاستوں سے رضا کار پہنچ گئے اور مسلمانوں نے اپنے گھر خالی کرنے شروع کئے، گھر، محلے، بازار جل رہے تھے، ہندوؤں کے گھر اور مسلمانوں کے گھر، اور سکھوں کے گھر۔ لیکن آخر میں مسلمانوں کے گھر سب سے زیادہ جلے۔ اور ہزاروں کی تعداد میں مسلمان اکٹھے ہو کر شہر سے بھاگنے لگے۔ موقع پر جو کچھ ہوا اسے تاریخ میں "امرتسر کا قتل عام" کہا جائے گا۔

لیکن ملٹری نے، حالات پر جلد قابو پا لیا۔ قتل عام بند ہوا اور ہندو اور مسلمان دو مختلف کیمپوں میں بند ہو کر پناہ گزین کہلانے لگے، ہندو پناہ گزین "شرنار تھی" کہلاتے تھے، اور مسلمان پناہ گزین "مہاجرین" گو مصیبت دونوں پر ایک ہی تھی، لیکن ان کے نام الگ الگ کر دیئے تھے، تاکہ مصیبت میں بھی یہ لوگ اکٹھے نہ ملیں، دونوں کیمپوں پر نہ چھت تھی نہ روشنی کا انتظام تھا۔ نہ سونے کے لئے بستر تھے، نہ پاخانے، لیکن ایک کیمپ ہندو اور سکھ شرنار تھیوں کا کیمپ کہلاتا تھا، دوسرا مسلمان مہاجرین کا۔

ہندو شرنار تھیوں کے کیمپ میں آزادی کی رات کو شدید بخار میں لرزتی ہوئی ایک ماں اپنے بیمار بیٹے کے سامنے دم توڑ رہی تھی، یہ لوگ مغربی پنجاب سے آئے تھے، پندرہ آدمیوں کا خاندان تھا۔ پاکستان سے ہندستان آتے آتے صرف دو افراد رہ گئے تھے، اور اب ان میں سے بھی ایک بیمار تھا۔ دوسرا دم توڑ رہا تھا۔ جب یہ پندرہ افراد کا قافلہ گھر سے چلا تھا۔ تو ان کے پاس بستر تھے سامان خوردونوش تھا۔ کپڑوں سے بھرے ہوئے ٹرنک تھے، روپیں کی پوٹلیاں تھیں اور عورتوں کے جسموں پر زیور تھے، اور لڑکے کے پاس ایک بائیسکل تھی، اور یہ سب پندرہ آدمی تھے۔

گجرانوالے تک پہنچتے پہنچتے دس آدمی رہ گئے۔ پہلے روپیہ گیا، پھر زیور، پھر عورتوں کے جسم۔

لاہور آتے آتے چھ آدمی رہ گئے، کپڑوں کے ٹرنک گئے، اور بستر بھی اور لڑکے کو اپنی بائیسکل کے چھن جانے کا بڑا افسوس تھا۔

اور جب مغلپورہ سے آگے بڑھے تو صرف دو رہ گئے، ماں اور ایک بیٹا، اور ایک لحاف، جو دم توڑتی ہوئی عورت لرزے کے بخار میں اس وقت اوڑھے ہوئے تھی۔

Scanned by CamScanner

اس وقت آدھی رات کے وقت' آزادی کی پہلی رات کو وہ عورت مر رہی تھی اور اس کی بیٹا چپ چاپ' اس کے سرہانے بیٹھا ہوا بخار سے کانپ رہا تھا اور اس کی کٹ کٹی بندھی ہوئی تھی' اور آنسو ایک مدت ہوئی ختم ہو چکے تھے۔

اور جب اس کی ماں مرگئی۔ تو اس نے آہستہ سے لحاف کو اس کے جسم سے الگ کیا اور اسے اوڑھ کر کیمپ کے دوسرے کونے میں چلا گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد ایک رضاکار اس کے پاس آیا اور اس سے کہنے لگا۔ "وہ..... ادھر..... تمہاری ماں تھی' جو مرگئی ہے؟"

"نہیں۔ نہیں مجھے کچھ معلوم نہیں۔ وہ کون تھی۔" لڑکے نے خوفزدہ ہو کر کہا اور زور سے لحاف کو اپنے گرد لپیٹتے ہوئے بولا۔ "وہ میری ماں نہیں تھی یہ لحاف میرا ہے۔ یہ لحاف میرا ہے۔ میں یہ لحاف نہیں دوں گا۔ یہ لحاف میرا ہے۔" وہ زور زور سے چیخنے لگا۔ "وہ میری ماں نہیں تھی۔ یہ لحاف میرا ہے میں اسے کسی کو نہ دوں گا۔ یہ لحاف میں ساتھ لایا ہوں۔ نہیں دوں گا نہیں! ایک لحاف' ایک ماں' ایک مردہ انسانیت' کسے معلوم تھا کہ ایک دن اس کی نئی تثلیث کی کہانی بھی مجھے آپ کو سنانی پڑے گی۔

جب مسلمان بھاگے تو ان کے گھر لٹنے شروع ہوئے' شائد ہی کوئی شریف آدمی رہا ہو۔ جس نے اس لوٹ میں حصہ نہ لیا ہو' آزادی کے تیسرے دن کا ذکر ہے میں اپنی گائے کو گلی کے باہر نل پر پانی پلانے لے جا رہا تھا۔ بالٹی میرے ہاتھ میں تھی' دوسرے ہاتھ میں گائے کے گلے سے بندھی ہوئی رسی تھی' گلی کے موڑ پر پہنچ کر میں نے میونسپلٹی کے لمپ والے کھمبے سے گائے کو باندھ دیا اور نل کی جانب بالٹی لئے مڑ گیا کہ بالٹی میں پانی بھر لاؤں' تھوڑی دیر کے بعد جب بالٹی بھر کے لایا تو کیا دیکھتا ہوں کہ گائے غائب ہے۔ ادھر ادھر بہتیرا دیکھا۔ لیکن گائے کہیں نظر نہیں آئی۔ یکایک میری نگاہ ساتھ والے مکان کے آنگن میں گئی۔ دیکھتا ہوں' تو گائے آنگن میں بندھی کھڑی ہے۔

میں گھر میں گھسا۔

"کیا ہے بھئی' کون ہو تم؟" ایک سردار صاحب نے نہایت خشونت سے کہا۔
میں نے کہا۔ "میں ابھی اپنی گائے کو اس سے باندھ کر نل پر پانی لانے گیا تھا۔ یہ گائے تو میری ہے سردار جی۔"

سردار جی مسکرائے۔ "ہلا! ہلا! کوئی گل نہیں۔ میں نے سمجھا کسی مسلمان کی گائے ہے۔ یہ آپ کی گائے ہے۔ تو پھر لے جایئے۔" اتنا کہہ کر انہوں نے گائی کی رسی کھول کر میرے ہات میں تھما دی۔

"معاف کرنا" میرے چلتے چلتے انہوں نے پھر کہا۔ "آپاں سمجھیا کسی مسلمان دی گائے ہے۔"

میں نے یہ واقعہ اپنے دوست سردار سندر سنگھ سے بیان کیا تو وہ بہت ہنسا "بھلا اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟" میں نے اس سے پوچھا تو وہ اور بھی زور سے ہنسنے لگا۔ سندر سنگھ میں آپ کو بتا دو اشتراکی ہے' اس لئے فرقہ وارانہ عناد سے بہت دور رہتا ہے۔ وہ میرے ان چند احباب میں سے ہے جنہوں نے اس لوٹ مار میں بالکل کوئی حصہ نہیں لیا۔

میں نے کہا۔ "تم اسے اچھا سمجھتے ہو؟"

وہ بولا۔ "نہیں یہ بات نہیں ہے۔ میں ہنس رہا تھا کیونکہ آج صبح ایک ایسا ہی واقعہ خود مجھے پیش آیا۔ میں حال بازار میں سے گزر رہا تھا کہ میں نے سوچا سامنے کٹڑے میں سے سردار سویرا سنگھ جی کو دیکھتا چلوں' پرانے غدر پارٹی کے لیڈر ہیں نا وہ۔ انہوں نے اپنے گاؤں میں تین چار سو مسلمانوں کو پناہ دے رکھی ہے۔ سوچا پوچھتا چلوں' ان کا کیا ہوا۔ انہیں وہاں سے نکال کر مہاجرین کے کیمپ میں لے جانے کی کیا سبیل کی جائے۔ یہ سوچ کر میں نے اپنی گاڑی محمد رزاق جوتے والے کی دکان (جو اب لٹ چکی ہے) کے آگے کھڑی کی اور کٹڑے میں گھس گیا۔ چند منٹ کے بعد ہی لوٹ کر آ گیا۔ کیونکہ بابا جی گھر پہ ملے نہیں۔ آ کے دیکھتا تو گاڑی غائب ہے۔ ابھی تو یہیں چھوڑی تھی! پوچھنے پر بھی کوئی نہیں بتاتا۔ اتنے میں میری نظر حال بازار کے آخری کونے میں پڑی وہاں میری گاڑی کھڑی تھی۔ لیکن ایک جیپ کے پیچھے بندھی

ہوئی۔ میں بھاگا بھاگا وہاں گیا۔ جیپ میں سردار..... سنگھ مشہور قومی کارکن بیٹھے ہوئے تھے۔

میں نے پوچھا۔ "کہاں جا رہے ہو؟"

"اپنے گاؤں جا رہا ہوں۔"

"اور یہ میری موٹر بھی کیا تمہارے گاؤں جائے گی؟"

"کون سی موٹر؟ وہ جو پیچھے بندھی ہوئی ہے؟ یہ تمہاری موٹر ہے؟ معاف کرنا پیارے' میں نے پہچانی نہیں۔ وہ محمد رزاق کی دکان کے سامنے کھڑی تھی نا۔ میں نے سوچا کسی مسلمان کی ہو گی۔ میں نے جیپ کے پیچھے باندھ لیا۔ ہاہاہا! میں تو اسے اپنے گھر لے جا رہا تھا۔ اچھا ہوا تم اس وقت پر آ گئے۔"

"اور اب کہاں جاؤ گے؟" میں نے اپنی موٹر کھول کر اس میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

"اب؟ اب کہیں اور جاؤں گا۔ کہیں نہ کہیں سے کوئی مال مل ہی جائے گا۔"

سردار سنگھ قومی کارکن ہیں۔ جیل جا چکے ہیں۔ جرمانے ادا کر چکے ہیں۔ سیاسی آزادی کے حصول کے لئے قربانیاں دے چکے ہیں۔"

یہ واقعہ سنا کر سندر سنگھ نے کہا۔ بدمعاشی و بربادی اس حد تک پھیل چکی ہے کہ ہمارے اچھے اچھے قومی کارکن بھی اس سے محفوظ نہیں رہے۔ ہماری سیاسی جماعتوں میں کام کرنے والے طبقے کا ایک جزو خود اس لوٹ مار' قتل و غارت گری میں شریک ہے۔ اس رو کو اگر اسی وقت روکا نہ گیا تو دونوں جماعتیں فسطائی ہو جائیں گی' یہی کوئی دو چار سال ہی ہیں۔

سندر سنگھ کا چہرہ متفکر دکھائی دے رہا تھا۔ میں وہاں سے اٹھ کے چلا آیا۔ راستے میں خالصہ کالج روڈ پر ایک مسلمان امیر کی کوٹھی لوٹی جا رہی تھی۔ اسباب کے لدے ہوئے چھکڑے مختلف گروہ لے جا رہے تھے۔ میرے دیکھتے دیکھتے چند منٹوں میں سب معاملہ ختم ہو گیا۔ سڑک پر چلنے والے ہندو اور سکھ راہ گیر بھی کوٹھی کی طرف بھاگے۔ لیکن پولیس کے سپاہیوں کو وہاں سے نکلتے ہوئے دیکھ کر ٹھٹھک گئے۔

پولیس کے سپاہیوں کے ہاتھوں میں چند جرابیں تھیں اور ریشمی ٹائیاں۔ ایک

کوٹ ہینگر پر مفلر پڑا ہوا تھا۔ انہوں نے مسکرا کر لوگوں سے کہا۔ "اب کہاں جاتے ہو۔ وہاں تو سب کچھ پہلے ہی ختم ہو چکا ہے۔

ایک مہاشے جو شکل و صورت سے آریہ سماجی معلوم ہوتے تھے اور میرے سامنے ہی کوٹھی کی طرف بھاگے تھے' اب مڑ کر میری طرف دیکھ کر کہنے لگے۔

"دیکھئے صاحب' دنیا کیسی پاگل ہو گئی ہے۔"

میرے قریب سے ایک دودھ بیچنے والا بھیا گزرا۔ بیچارے کے حصے میں چند کتابیں آئی تھیں۔ وہ انہیں اٹھائے لے جا رہا تھا۔

میں نے پوچھا۔ "ان کتابوں کا کیا کرو گے' پڑھ سکتے ہو؟"

"نا بابو جی۔"

"پھر؟"

اس نے کتابوں کی طرف غصے سے دیکھا۔ بولا ہم کا کریں بابو۔ جدھر جاتے ہیں لوگ پہلے ہی اچھا اچھا سامان اٹھا لے جاتے ہیں ہماری تو کسمت خراب ہے بابو۔"

اس نے پھر کتابوں کو غصے سے رکھا۔ اس کا ارادہ تھا۔ انہیں سڑک پر پھینک دے۔ پھر اس کا ارادہ بدل گیا۔ وہ مسکرا کر کہنے لگا کوئی بات نہیں یہ موٹی موٹی کتابیں چولہے میں خوب جلیں گی۔ رات کے بھوجن کے لئے لکڑیوں کی جرورت نہیں۔"

بڑی اچھی کتابیں تھیں۔ سب چولہے میں گئیں۔ ارسطو' سقراط' افلاطون' روسو' شیکسپئر سب چولہے میں گئے۔

سہ پہر کے قریب بازار سنسان پڑنے لگے۔ کرفیو ہونے والا تھا۔ میں جلدی جلدی کوچہ رام داس سے نکلا اور مقدس گوردوارے کو تعلیم دیتا ہوا اپنے گھر کی جانب بڑھ گیا۔ راستے میں اندھیری گلی پڑتی۔ جہاں جلیانوالے باغ کے روز لوگوں کو گھٹنوں کے بل چلنے پر مجبور کر دیا گیا تھا۔ میں نے سوچا میں اس گلی سے کیوں نہ نکل جاؤں۔ یہ راستہ ٹھیک رہے گا۔ میں اسی گلی کی طرف گھوم گیا۔

یہ گلی تنگ ہے اور یہاں دن کو بھی اندھیرا سا رہتا ہے۔ یہاں مسلمانوں کے آٹھ دس گھر تھے۔ وہ سب کے سب جلائے گئے تھے یا لوٹے گئے تھے۔ دروازے کھلے

لخت بیگانہ ہو گیا تھا اور اس نے اپنے مہربان سینے کے کواڑ ان پر بند کر دیئے تھے اور وہ ایک نئے دیس کے تپتے ہوئے میدانوں کا تصور دل میں لئے بادل نخواستہ وہاں سے رخصت ہو رہے تھے' اس امر کی مسرت ضرور تھی کہ ان کی جانیں بچ گئی تھیں۔ ان کا بہت سا مال و متاع اور ان کی بہوؤں بیٹیوں' ماؤں اور بیویوں کی آبرو محفوظ تھی' لیکن ان کا دل رو رہا تھا اور آنکھیں سرحد کے پتھریلے سینے پر یوں گڑی ہوئی تھیں' گویا اسے چیر کر اندر گھس جانا چاہتی ہیں اور اس کے شفقت بھرے ماتا کے فوارے سے پوچھنا چاہتی ہیں۔ بول ماں۔ آج کس جرم کی پاداش میں تو نے اپنے بیٹوں کو گھر سے نکال دیا ہے۔ اپنی بہوؤں کو اس خوبصورت آنگن سے محروم کیا ہے۔ جہاں وہ کل تک سہاگ کی رانیاں بنی بیٹھی تھیں۔ اپنی البیلی کنواریوں کو جو انگور کی بیل کی طرح تیری چھاتی سے لپٹ رہی تھیں جھنجھوڑ کر الگ کر دیا ہے۔ کس لئے آج یہ دیس بدیس ہو گیا ہے۔ میں چلتی جا رہی تھی اور ڈبوں میں بیٹھی ہوئی مخلوق اپنے وطن کی سطح مرتفع' اس کی بلند و بالا چٹانوں اس کے مرغزاروں' اس کی شاداب وادیوں' کنجوں اور باغوں کی طرف یوں دیکھ رہی تھی' جیسے ہر جانے پہچانے منظر کو اپنے سینے میں چھپا کے لے جانا چاہتی ہے' جیسے نگاہ ہر لحظہ رک جائے' اور مجھے ایسا معلوم ہوا کہ اس عظیم رنج و الم کے بارے میرے قدم بھاری ہوئے جا رہے ہیں اور ریل کی پٹڑی مجھے جواب دیئے جا رہی ہے۔

حسن ابدال تک لوگ یوں ہی محزوں' افسردہ' یاس و نکبت کی تصویر بنے رہے۔ حسن ابدال کے اسٹیشن پر بہت سے سکھ آئے ہوئے تھے۔ پنجہ صاحب سے لمبی لمبی کرپانیں لئے' چہروں پر ہوائیاں اڑی ہوئیں' بال بچے سہمے سہمے سے' ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اپنی ہی تلوار کے گھاؤ سے یہ لوگ خود مر جائیں گے۔ ڈبوں میں بیٹھ کر ان لوگوں نے اطمینان کا سانس لیا اور پھر دوسرے سرحد کے ہندو اور سکھ پٹھانوں سے گفتگو شروع ہو گئی۔ کسی کا گھر بار جل گیا تھا۔ کوئی صرف ایک قمیص اور شلوار میں بھاگا تھا۔ کسی کے پاؤں میں جوتی نہ تھی' اور کوئی اتنا ہوشیار تھا کہ اپنے گھر کی ٹوٹی چارپائی تک اٹھا لایا تھا جن لوگوں کا واقعی بہت نقصان ہوا تھا وہ لوگ گم صم بیٹھے

تھے۔ خاموش، چپ چاپ اور جس کے پاس کبھی کچھ نہ ہوا تھا۔ وہ اپنی لاکھوں کی جائیداد کے کھونے کا غم کر رہا تھا اور دوسروں کو اپنی فرضی امارت کے قصے سنا سنا کر مرعوب کر رہا تھا اور مسلمانوں کو گالیاں دے رہا تھا۔ بلوچ سپاہی ایک پروقار انداز میں دروازوں پر رائفلیں تھامے کھڑے تھے اور کبھی کبھی ایک دوسرے کی طرف کنکھیوں سے دیکھ کر مسکرا اٹھتے۔

ٹکشلا کے اسٹیشن پر مجھے بہت عرصے تک کھڑا رہنا پڑا۔ نجانے کس کا انتظار تھا۔ شاید آس پاس کے گاؤں سے ہندو پناہ گزین آ رہے تھے۔ جب گارڈ نے اسٹیشن ماسٹر سے بار بار پوچھا تو اس نے کہا۔ یہ گاڑی آگے نہ جا سکے گی۔ ایک گھنٹہ اور گزر گیا۔ اب لوگوں نے اپنا سازو سامان خوردو نوش کھولا اور کھانے لگے۔ سہمے سہمے بچے، قہقہے لگانے لگے، اور معصوم کنواریاں دریچوں سے باہر جھانکنے لگیں اور بڑے بوڑھے حقے گڑگڑانے لگے۔ تھوڑی دیر کے بعد دور سے شور سنائی دیا اور ڈھولوں کے پیٹنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔

ہندو پناہ گزینوں کا جتھا آ رہا تھا شاید، لوگوں نے سر نکال کر ادھر ادھر دیکھا جتھا دور سے آ رہا تھا۔ وقت گزرتا گیا جتھا قریب آتا گیا۔ ڈھولوں کی آواز تیز تر ہوتی گئی۔ جتھے کے قریب آتے ہی گولیوں کی آوازیں کانوں میں آئیں اور لوگوں نے اپنے سر کھڑکیوں سے پیچھے ہٹا لئے۔ یہ ہندوؤں کا جتھا تھا۔ جو آس پاس کے گاؤں سے آیا تھا۔ گاؤں کے مسلمان لوگ اسے اپنے حفاظت میں لا رہے تھے، چنانچہ ہر ایک مسلمان نے ایک کافر کی لاش اپنے کندھے پر اٹھا رکھی تھی، جس نے جان بچا کر گاؤں سے بھاگنے کی کوشش کی تھی، دو سو لاشیں تھیں۔ مجمع نے یہ لاشیں نہایت اطمینان سے اسٹیشن پر پہنچ کر بلوچی دستے کے سپرد کیں اور کہا کہ وہ ان مہاجرین کو نہایت حفاظت سے ہندستان کی سرحد پر لے جائے۔ چنانچہ بلوچ سپاہیوں نے نہایت تنذ پیشانی سے اس بات کا ذمہ لیا اور ہر ڈبے میں پندرہ بیس لاشیں رکھ دی گئیں۔ اس کے بعد مجمع نے ہوا میں فائر کیا اور گاڑی چلانے کے لئے اسٹیشن ماسٹر کو حکم دیا۔ میں چلنے لگی تھی کہ پھر مجھے روک دیا گیا اور مجمع کے سرغنے نے ہندو پناہ گزینوں سے کہا کہ دو سو

تھے۔ کھڑکیاں ٹوٹی ہوئیں' کہیں کہیں چھتیں جلی ہوئیں۔ گلی میں سناٹا تھا' گلی کے فرش پر عورتوں کی لاشیں پڑی تھی۔

میں پلٹنے لگا۔ اتنے میں کسی کے کراہنے کی آواز آئی۔ گلی کے بیچ میں لاشوں کے درمیان ایک بڑھیا رینگنے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں نے اسے سہارا دیا۔

"پانی بیٹا۔"

میں اوک میں پانی لایا۔ مقدس گردوارے کے سامنے پانی کا نل تھا۔

میں نے اپنی اوک اس کے ہونٹوں سے لگا دی۔

"تم پر خدا کی رحمت ہو بیٹا! تم کون ہو؟ خیر تم جو کوئی بھی ہو۔ تم پر خدا کی رحمت ہو بیٹا۔ یہ ایک مرنے والی کے الفاظ ہیں انہیں یاد رکھنا۔"

میں نے اسے اٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ تمہیں کہاں چوٹ آئی ہے ماں؟"

بڑھیا نے کہا۔ "مجھے مت اٹھاؤ۔ میں یہیں مروں گی۔ اپنی بہو بیٹیوں کے درمیان' کیا کہا تم نے' چوٹ' ارے بیٹا یہ چوٹ بہت گہری ہے۔ یہ گھاؤ دل کے اندر ہے۔ بہت گہرا گھاؤ ہے' تم لوگ اس سے کیسے پنپ سکو گے؟ تمہیں خدا کیسے معاف کرے گا؟"

"ہمیں معاف کر دو ماں۔"

مگر بڑھیا نے کچھ نہیں سنا۔ وہ آپ ہی آپ کہتی جا رہی تھی۔ "پہلے انہوں نے ہمارے مردوں کو مارا' پھر ہمارے گھر لوٹے' پھر ہمیں گھسیٹ کر گلی میں لے آئے اور اس گلی میں' اس فرش پر۔ اس مقدس گردوارے کے سامنے جسے میں ہر روز تعظیم دیا کرتی تھی۔ انہوں نے ہماری عصمت دری کی اور پھر ہمیں گولی سے مار دیا۔ میں تو ان کی دادیوں کی ہم عمر تھی' انہوں نے مجھے بھی معاف نہیں کیا۔"

یکایک اس نے مجھے آستین سے پکڑ لیا۔ "تو جانتا ہے۔ یہ امرتسر کا شہر ہے۔ یہ میرا شہر ہے۔ اس مقدس گردوارے کو میں روز سلام کرتی تھی' جیسے اپنی مسجد کو سلام کرتی ہوں' میری گلی میں ہندو مسلمان سکھ بھی بستے ہیں اور کئی پشتوں سے ہم لوگ

یہاں بستے چلے آئے ہیں اور ہم ہمیشہ ہمیشہ محبت سے اور پیار سے اور صلح سے رہے اور کبھی کچھ نہیں ہوا۔"

"میرے ہم مذہبوں کو معاف کرو اماں۔"

"تو جانتا ہے میں کون ہوں؟ میں زینب کی اماں ہوں۔ تو جانتا ہے زینب کون تھی؟ زینب وہ لڑکی تھی جس نے جلیانوالے روز اس گلی میں گورے کے آگے سر نہیں جھکایا۔ جو اپنے ملک اور اپنی قوم کے لئے سراونچا کئے اس گلی میں سے گزر گئی۔ یہی وہ گلی ہے' یہی وہ جگہ ہے جہاں زینب شہید ہوئی تھی۔

میں اسی زینب کی ماں ہوں۔ میں ایسی آسانی سے تمہارا پیچھا چھوڑنے والی نہیں ہوں۔ مجھے سہارا دو۔ مجھے کھڑا کر دو' میں اپنی لٹی ہوئی آبرو اور اپنی بہو بیٹیوں کی برباد عصمتیں لے کر سیاست دانوں کے پاس جاؤں گی۔ مجھے سہارا دو۔ میں ان سے کہوں گی' میں زینب کی ماں ہوں۔ میں امرتسر کی ماں ہوں۔ میں پنجاب کی ماں ہوں۔ تم نے میری گود اجاڑی ہے۔ تم نے بڑھاپے میں میرا منہ کالا کیا ہے۔ میری جوان جہان بہوؤں اور بیٹیوں کی پاک و صاف روحوں کو جہنم کی آگ میں جھونکا ہے۔ میں ان سے پوچھوں گی' کیا زینب اسی آزادی کے لئے قربان ہوئی تھی! میں زینب کی ماں ہوں!" یکایک وہ میری گود میں جھک گئی۔ اس کے منہ سے خون ابل پڑا۔ دوسرے لمحے میں اس نے جان دے دی۔

زینب کی ماں میری گود میں مری پڑی تھی اور اس کا لہو میری قمیص پر ہے اور میں زندگی سے موت کے دروازے تک جھانک رہا ہوں اور تخیل میں صدیق اور اوم پرکاش ابھرتے چلے آتے ہیں اور زینب کا سر غرور سے فضا میں ابھرتا چلا آتا ہے اور شہید مجھ سے کہتے ہیں کہ ہم پھر آئیں گے۔ صدیق' اوم پرکاش ہم پھر آئیں گے۔ شام کور' زینب' پارو' بیگم..... ہم پھر آئیں گے۔ اپنی عصمتوں کا تقدس لئے ہوئے اپنی بے داغ روحوں کا عزم لئے ہوئے۔ کیونکہ ہم انسان ہیں۔ ہم اس ساری کائنات میں تخلیق کے علم بردار ہیں اور کوئی تخلیق کو مار نہیں سکتا۔ کوئی اس کی عصمت دری نہیں کر سکتا۔ کوئی اسے لوٹ نہیں سکتا۔ کیونکہ ہم تخلیق ہیں اور تم تخریب ہو' تم وحشی ہو' تم درندے ہو' تم مر جاؤ گے' لیکن ہم نہیں مریں گے۔ کیونکہ انسان کبھی نہیں مرتا۔ وہ درندہ نہیں ہے۔ وہ نیکی کی روح ہے۔ خدائی کا حاصل ہے۔ کائنات کا غرور ہے۔

پیشاور ایکسپریس

جب میں پشاور سے چلی، تو میں نے چھکا چھک اطمینان کا سانس لیا۔ میرے ڈبوں میں زیادہ تر ہندو لوگ بیٹھے ہوئے تھے، یہ لوگ پیشاور سے ہوتے مردان سے، کوہاٹ سے، چار سدہ سے، خیبر سے، لنڈی کوتل سے، بنوں، نوشہرہ، مانسہرہ سے آئے تھے، اور پاکستان میں جان و مال کو محفوظ نہ پا کر ہندستان کا رخ کر رہے تھے۔ اسٹیشن پر زبردست پہرہ تھا اور فوج والے بڑی چوکسی سے کام کر رہے تھے۔ ان لوگوں کو جو پاکستان میں پناہ گزین اور ہندستان میں شرنارتھی کہلاتے تھے اس وقت تک چین کا سانس نہ آیا جب تک میں نے پنجاب کی رومان خیز سرزمین کی طرف قدم نہ بڑھائے۔ یہ لوگ شکل و صورت سے بالکل پٹھان معلوم ہوتے تھے گورے چٹے مضبوط ہات پاؤں، سر پر کلاہ اور لنگی اور جسم پر قمیص اور شلوار، یہ لوگ پشتو میں بات کرتے تھے اور کبھی کبھی نہایت کرخت قسم کی پنجابی میں بات چیت کرتے تھے۔ ان کی حفاظت کے لئے ہر ڈبے میں دو سپاہی بندوقیں لے کر کھڑے تھے۔ وجیہہ بلوچ سپاہی، اپنی پگڑیوں کے عقب میں مور کے چھتر کی طرح خوبصورت طرے لگائے ہوئے، ہات میں جدید رائفلیں لئے ہوئے ان ہندو پٹھانوں اور ان کے بیوی بچوں کی طرف مسکرا مسکرا کر دیکھتے تھے۔ جو ایک تاریخی خوف اور شر کے زیر اثر اس سرزمین سے بھاگے جا رہے تھے۔ جہاں وہ ہزاروں سال سے رہتے چلے آئے تھے۔ جس کی سنگلاخ سرزمین سے انہوں نے توانائی حاصل کی تھی، جس کے برفاب چشموں سے انہوں نے پانی پیا تھا اور جس کے حسین چمن زاروں سے انہوں نے انگوروں کا رس پیا تھا آج یہ وطن یک

آدمیوں کے چلے جانے سے ان کے گاؤں ویران ہو جائیں گے اور ان کی تجارت تباہ ہو جائے گی اس لئے وہ گاڑی میں سے دو سو آدمی اتار کر اپنے گاؤں لے جائیں گے چاہے کچھ بھی ہو۔ وہ اپنے ملک کو یوں برباد ہوتا ہوا نہیں دیکھ سکتے' اس پر بلوچ سپاہیوں نے ان کی فہم و ذکا اور ان کی فراست طبع کی داد دی اور ان کی وطن دوستی کو سراہا۔ چنانچہ اس پر بلوچی سپاہیوں نے ہر ڈبے سے کچھ آدمی نکال کر مجمع کے حوالے کئے' پورے دو سو آدمی نکالے گئے ایک کم نہ ایک زیادہ۔

لائن لگاؤ کافرو! سرغنے نے کہا۔ سرغنہ اپنے علاقہ کا سب سے بڑا جاگیردار تھا اور اپنے لہو کی روانی میں مقدس جہاد کی گونج سن رہا تھا۔

کافر پتھر کے بت بنے کھڑے تھے۔ مجمع کے لوگوں نے انہیں اٹھا اٹھا کر لائن میں کھڑا کیا۔ دو سو آدمی' دو سو زندہ لاشیں۔ چہرے ستے ہوئے۔ آنکھیں فضا میں تیروں کی بارش سی محسوس کرتی ہوئی۔

پہل بلوچ سپاہیوں نے کی۔ پندرہ آدمی فائرنگ پندرہ آدمی فائرنگ سے گر گئے۔

یہ ٹکشلا کا اسٹیشن تھا۔

بیس اور آدمی گر گئے۔

یہاں ایشیا کی سب سے بڑی یونیورسٹی تھی اور لاکھوں طالب علم اس تہذیب و تمدن کے گہوارے سے کسب فیض کرتے تھے۔

پچاس اور مارے گئے۔

ٹکشیلا کے عجائب گھر میں اتنے خوبصورت بت تھے' اتنے حسین سنگ تراشی کے نادر نمونے' قدیم تہذیب کے جھلملاتے ہوئے چراغ۔

پچاس اور مارے گئے۔

پس منظر میں سرکوب کا محل تھا اور کھیلوں کا اکھاڑا تھیٹر اور میلوں تک پھیلے ہوئے ایک وسیع شہر کے کھنڈر ٹکشلا کی گذشتہ عظمت کے پرشکوہ مظہر۔

تیس اور مارے گئے۔

یہاں کنشک نے حکومت کی تھی اور لوگوں کو امن و آشتی اور حسن و دولت

سے مالا مال کیا تھا۔

پچیس اور مارے گئے۔

یہاں بدھ کا نغمہ عرفان گونجا تھا۔ یہاں بھکشوؤں نے امن و صلح و آشتی کا درس حیات دیا تھا۔

اب آخری گروہ کی اجل آگئی تھی۔

یہاں پہلی بار ہندستان کی سرحد پر اسلام کا پرچم لہرایا تھا۔ مساوات اور اخوت اور انسانیت کا پرچم۔

سب مر گئے' اللہ اکبر' فرش خون سے لال تھا اور جب میں پلیٹ فارم سے گزری تو میرے پاؤں ریل کی پٹڑی سے پھسلے جاتے تھے۔ جیسے میں ابھی گر جاؤں گی اور گر کر باقی ماندہ مسافروں کو بھی ختم کر ڈالوں گی۔

ہر ڈبے میں موت آگئی تھی اور لاشیں درمیان میں رکھ دی گئی تھیں اور زندہ لاشوں کا ہجوم چاروں طرف تھا اور بلوچ سپاہی..... مسکرا رہے تھے۔ کہیں کوئی بچہ رونے لگا۔ کسی بوڑھی ماں نے سسکی لی۔ کسی کے لٹے ہوئے سہاگ نے آہ کی' اور چیختی چلاتی' راولپنڈی کے پلیٹ فارم پر آکھڑی ہوئی۔

یہاں سے کوئی پناہ گزین گاڑی میں سوار نہ ہوا۔ ایک ڈبے میں چند مسلمان نوجوان پندرہ بیس برقعہ پوش عورتوں کو لے کر سوار ہوئے۔ ہر نوجوان رائفل سے مسلح تھا۔ ایک ڈبے میں بہت سا سامان جنگ لادا گیا' مشین گنیں' اور کارتوس، پستول اور رائفلیں۔

جہلم اور گوجر خاں کے درمیانی علاقے میں مجھے سگنل کھینچ کر کھڑا کر دیا گیا۔ میں رک گئی۔ مسلح نوجوان گاڑی سے اترنے لگے۔ برقعہ پوش خواتین نے شور مچانا شروع کیا۔ ہم ہندو ہیں' ہم سکھ ہیں' ہمیں زبردستی لے جا رہے ہیں۔ انہوں نے برقعے پھاڑ دیئے اور چلانے لگیں۔ نوجوان مسلمان ہنستے ہوئے گھسیٹ گھسیٹ کر گاڑی سے نکال لائے۔

ہاں یہ ہندو عورتیں ہیں۔ ہم انہیں راولپنڈی سے ان کے آرام دہ گھروں' ان

کے خوشحال گھرانوں' ان کے عزت دار ماں باپ سے چھین کر لائے ہیں۔ اب یہ ہماری ہیں۔ ہم ان کے ساتھ جو چاہے سلوک کریں گے۔ اگر کسی میں ہمت ہے تو انہیں ہم سے چھین کر لے جائے۔

سرحد کے دو نوجوان ہندو پٹھان چھلانگ مار کر گاڑی سے اتر گئے بلوچ سپاہیوں نے نہایت اطمینان سے فائر کر کے انہیں ختم کر دیا پندرہ بیس نوجوان اور نکلے۔ انہیں مسلح مسلمانوں کے گروہ نے منٹوں میں ختم کر دیا۔ دراصل گوشت کی دیوار لوہے کی گولی کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ نوجوان ہندو عورتوں کو گھسیٹ کر جنگل میں لے گئے اور میں منہ چھپا کر وہاں سے بھاگی۔ کالا' خوفناک سیاہ دھواں میرے منہ سے نکل رہا تھا۔ جیسے کائنات پر خباثت کی سیاہی چھا گئی تھی' اور سانس میرے سینے میں یوں الجھنے لگی جیسے یہ آہنی چھاتی ابھی پھٹ جائے گی اور اندر بھڑکتے ہوئے لال لال شعلے اس جنگل کو خاک سیاہ کر ڈالیں گے' جو اس وقت میرے آگے پیچھے پھیلا ہوا تھا اس جس نے ان پندرہ عورتوں کو چشم زدن میں نگل لیا تھا۔

لالہ موسیٰ کے قریب لاشوں سے اتنی مکروہ سڑانڈ نکلنے لگی کہ بلوچ سپاہی انہیں باہر پھینکنے پر مجبور ہو گئے' وہ بات کے اشارے سے ایک آدمی کو بلاتے اور اس سے کہتے' اس لاش کو اٹھا کر یہاں لاؤ دروازے پر اور جب وہ آدمی ایک لاش اٹھا کر دروازے پر لاتا تو وہیں اسے گاڑی سے باہر دھکا دے دیتے۔ تھوڑی دیر ہی میں سب لاشیں ایک ایک ہمراہی کے ساتھ باہر پھینک دی گئیں اور ڈبوں میں آدمی کم ہو جانے سے ٹانگیں پھیلانے کی جگہ بھی ہو گئی۔

پھر لالہ موسیٰ گزر گیا اور وزیر آباد آ گیا۔ وزیر آباد کا مشہور جنکشن' وزیر آباد کا مشہور شہر۔ جہاں ہندستان بھر کے لئے چھریاں اور چاقو تیار ہوتے ہیں۔ وزیر آباد جہاں کے ہندو اور مسلمان صدیوں سے بیساکھی کا میلہ بڑی دھوم دھام سے مناتے ہیں اور اس کی خوشیوں میں اکٹھے حصہ لیتے ہیں۔ وزیر آباد کا سٹیشن لاشوں سے پٹا ہوا تھا۔ شاید یہ لوگ بیساکھی کا میلہ دیکھنے آئے تھے' لاشوں کا میلہ' شہر میں دھواں اٹھ رہا تھا اور اسٹیشن کے قریب انگریزی بینڈ کی صدا سنائی دے رہی تھی' اور ہجوم کی پرشور

تالیوں اور قہقہوں کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں' چند منٹوں میں ہجوم اسٹیشن پر آگیا' آگے آگے دیہاتی ناچتے گاتے آ رہے تھے اور ان کے پیچھے ننگی عورتوں کا ہجوم تھا۔ مادر زاد ننگی عورتیں' بوڑھی' نوجوان' بچیاں' دادیاں اور پوتیاں' مائیں اور بہوئیں اور بیٹیاں' کنواریاں اور حاملہ عورتیں' ناچتے گاتے ہوئے مردوں کے نرغے میں تھیں' عورتیں سندو اور سکھ تھیں اور مرد مسلمان تھے' اور دونوں نے مل کر یہ عجیب بیساکھی منائی تھی' عورتوں کے بال کھلے ہوئے تھے۔ ان کے جسموں پر زخموں کے نشان تھے اور وہ اس طرح سیدھی تن کر چل رہی تھیں' جیسے ہزار کپڑوں میں ان کے جسم چھپے ہوں۔ جیسے ان کی روحوں پر سکون آمیزموت کے دبیز سائے چھا گئے ہوں۔ ان کی نگاہوں کا جلا دروپدی کو بھی شرماتا تھا اور ہونٹ دانتوں کے اندر یوں بھنچے ہوئے تھے گویا کسی مہیب لاوے کا منہ بند کئے ہوئے ہیں۔ شائد ابھی یہ لاوا پھٹ پڑے گا اور اپنی آتش فشانی سے دنیا کو جہنم دار بنا دے گا۔

مجمع میں سے آوازیں آئیں۔ ''پاکستان زندہ باد۔''

''اسلام زندہ باد۔ قائد اعظم محمد علی جناح زندہ باد''

ناچتے تھرکتے ہوئے قدم پرے ہٹ گئے اور اب یہ عجیب و غریب ہجوم ڈبوں کے عین سامنے تھا۔ ڈبوں میں بیٹھی ہوئی عورتوں نے گھونگھٹ کاڑھ لئے اور ڈبے کی کھڑکیاں یکے بعد دیگر بند ہونے لگیں۔

بلوچ سپاہیوں نے کہا۔ کھڑکیاں مت بند کرو ہوا رکتی ہے۔ کھڑکیاں بند ہوتی گئیں۔ بلوچ سپاہیوں نے بندوقیں تان لیں۔ ٹھائیں ٹھائیں پھر بھی کھڑکیاں بند ہوتی گئیں اور پھر ڈبے میں ایک کھڑکی بھی کھلی نہ رہی' ہاں کچھ پناہ گزین ضرور مر گئے تھے۔

ننگی عورتیں پناہ گزینوں کے ساتھ بٹھا دی گئیں اور میں اسلام زندہ باد اور قائد اعظم محمد علی جناح زندہ باد کے نعروں کے درمیان رخصت ہوئی۔

گاڑی میں بیٹھا ہوا ایک بچہ لڑھکتا لڑھکتا ایک بوڑھی دادی کے پاس چلا گیا۔ اس سے پوچھنے لگا ماں تم نہا کے آئی ہو؟''

دادی نے اپنے آنسوؤں کو روکتے ہوئے کہا۔ ہاں ننھے، آج مجھے میرے وطن کے بیٹوں نے بھائیوں نے نہلایا ہے۔

تمہارے کپڑے کہاں ہیں اماں؟

ان پر میرے سہاگ کے خون کے چھینٹے تھے بیٹا۔ وہ لوگ انہیں دھونے کے لئے لے گئے ہیں۔ دو ننگی لڑکیوں نے گاڑی سے چھلانگ لگا دی اور میں چیختی چلاتی آگے بھاگی اور لاہور پہنچ کر دم لیا۔

مجھے نمبر ایک پلیٹ فارم پر کھڑا کیا گیا۔ نمبر ۲ پلیٹ فارم پر دوسری گاڑی کھڑی تھی۔ یہ امرتسر سے آئی تھی، اور اس میں مسلمان پناہ گزین بند تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد مسلم خدمات گار میرے ڈبوں کی تلاشی لینے لگے اور زیور اور نقدی اور دوسرا قیمتی سامان مہاجرین سے لے لیا گیا۔ اس کے بعد چار سو آدمی ڈبوں سے نکال کر اسٹیشن پر کھڑے کئے گئے۔ یہ مذبح کے بکرے تھے۔ کیونکہ ابھی ابھی نمبر ۲ پلیٹ فارم پر جو مسلم مہاجرین کی گاڑی آ کے رکی تھی اس میں چار سو مسلمان مسافر کم تھے اور پچاس مسلم عورتیں اغوا کر لی گئی تھیں۔ اس لئے یہاں پر بھی پچاس عورتیں چن چن کر نکال لی گئیں اور چار سو ہندو مسافروں کو تہ تیغ کیا گیا تاکہ ہندستان اور پاکستان میں آبادی کا توازن برقرار رہے۔

مسلم خدمت گاروں نے ایک دائرہ بنا رکھا تھا اور چھرے ہات میں تھے اور دائرے میں باری باری ایک مہاجر ان کے چھرے کی زد میں آتا تھا اور بڑی چابک دستی اور مشاقی سے ہلاک کر دیا جاتا تھا۔ چند منٹوں میں چار سو آدمی ختم کر دیئے گئے اور پھر میں آگے چلی۔ اب مجھے اپنے جسم کے ذرے ذرے سے گھن آنے لگی تھی۔ اس قدر پلید اور متعفن محسوس کر رہی تھی۔ میں جیسے مجھے شیطان نے سیدھا جہنم سے دھکا دے کر پنجاب میں بھیج دیا ہو۔ اٹاری پہونچ کر فضا بدل سی گئی۔ مغلپورہ ہی سے بلوچ سپاہی بدلے گئے تھے اور ان کی جگہ ڈوگروں اور سکھ سپاہیوں نے لے لی تھی، لیکن اٹاری پہنچ کر تو مسلمانوں کی اتنی لاشیں ہندو مہاجرین نے دیکھیں کہ ان کے دل فرط مسرت سے باغ باغ ہو گئے۔ آزاد ہندستان کی سرحد آ گئی تھی۔ ورنہ اتنا

حسین منظر کس طرح دیکھنے کو ملتا اور جب میں امرتسر اسٹیشن پر پہنچی تو سکھوں کے نعروں نے زمین آسمان کو گونجا دیا۔ یہاں بھی مسلمانوں کی لاشوں کے ڈھیر تھے اور ہندو جاٹ اور سکھ اور ڈوگرے ہر ڈبے میں جھانک کر پوچھتے تھے "کوئی شکار ہے" مطلب یہ کہ کوئی مسلمان ہے۔

ایک ڈبے میں چار ہندو براہمن سوار ہوئے' سر گھٹا ہوا' لمبی چوٹی' رام نام کی دھوتی باندھے' ہردوار کا سفر کر رہے تھے۔ یہاں ہر ڈبے میں آٹھ دس سکھ اور جاٹ بھی بیٹھ گئے۔ یہ لوگ رائفلوں اور بلموں سے مسلح تھے اور مشرقی پنجاب میں شکار کی تلاش میں جا رہے تھے۔ ان میں سے ایک کے دل میں کچھ شبہ سا ہوا۔ اس نے ایک براہمن سے پوچھا۔

براہمن دیوتا کدھر جا رہے ہو؟

ہردوار۔ تیرتھ کرنے۔

"ہردوار جا رہے ہو کہ پاکستان جا رہے ہو۔"

میاں اللہ کرو۔ دوسرے براہمن کے منہ سے نکلا۔

جاٹ ہنسا۔ تو آؤ اللہ اللہ کریں۔ اوتھا سیاں' شکار مل گیا بھئی آور ایہدا اللہ بیلی کریئے۔ اتنا کہہ کر جاٹ نے بلم نقلی براہمن کے سینے میں مارا اوور دوسرے براہمن بھاگنے لگے۔ جاٹوں نے انہیں پکڑ لیا۔ ایسے نہیں براہمن دیوتا ذرا ڈاکٹری معائنہ کراتے جاؤ' ہردوار جانے سے پہلے ڈاکٹری معائنہ بہت ضروری ہے نا۔

ڈاکٹری معائنے سے مراد یہ تھی کہ وہ لوگ ختنہ دیکھتے تھے اور جس کے ختنہ ہوا ہوتا اسے وہیں مار ڈالتے۔ چاروں مسلمان جو براہمن کا روپ بدل کر اپنی جان بچانے کے لئے بھاگ رہے تھے۔ وہیں مار ڈالے گئے اور میں آگے چلی۔

راستے میں ایک جگہ جنگل میں مجھے یک لخت کھڑا کر دیا گیا اور لوگ یعنی مہاجرین اور سپاہی اور جاٹ اور سکھ سب نکل نکل کر جنگل کی طرف بھاگنے لگے۔ میں نے سوچا شاید مسلمانوں کی بہت بڑی فوج ان پر حملہ کرنے کے لئے آ رہی ہے۔ اتنے میں کیا دیکھتی ہوں کہ جنگل میں بہت سارے مسلمان مزارع اپنے بیوی بچوں کو

لئے چھپے بیٹھے ہیں۔ ست سری اکال اور ہندو دھرم کی جے کے نعروں کی گونج سے جنگل کانپ اٹھا اور وہ لوگ نرغے میں لے لئے گئے۔ آدھے گھنٹے میں سب صفایا ہو گیا۔ بڈھے' جوان' عورتیں اور بچے سب مار ڈالے گئے۔ ایک جاٹ کے نیزے پر ایک ننھے سے بچے کی لاش تھی' اور وہ اسے ہوا میں گھما گھما کر کہہ رہا تھا۔ آئی بیساکھی' آئی بیساکھی' جٹا لائے بے بے۔

جالندھر سے ادھر پٹھانوں کا ایک گاؤں تھا۔ یہاں پر گاڑی روک کر لوگ گاؤں میں گھس گئے۔ سپاہی اور مہاجرین اور جاٹ پٹھانوں نے مقابلہ کیا۔ لیکن آخر میں مارے گئے' بچے اور مرد ہلاک ہو گئے تو عورتوں کی باری آئی اور میں وہیں اسی کھلے میدان میں جہاں گیہوں کے کھلیان لگائے جاتے تھے اور سرسوں کے پھول مسکراتے تھے اور عفت ماب بیبیاں اپنے خاوندوں کی نگاہ شوق کی تاب نہ لا کر کمزور شاخوں کی طرح جھکی جھکی جاتی تھیں۔ اسی وسیع میدان میں جہاں پنجاب کے دل نے ہیر رانجھے اور سوہنی مینوال کی لافانی الفت کے ترانے گائے تھے' انہیں شیشم' سرس اور پیپل کے درختوں تلے وقتی چکلے آباد ہوئے۔ پچاس عورتیں اور پانسو خاوند' پچاس بھیڑیں اور پانسو قصاب' پچاس سوہنیاں اور پان سو مینوال' شاید اب چناب میں کبھی طغیانی نہ آئے گی۔ شاید اب کوئی وارث شاہ کی ہیر نہ گائے گا۔ شاید اب مرزا صاحباں کی داستان الفت و عفت ان میدانوں میں کبھی نہ گونجے گی۔ لاکھوں بار لعنت ہو ان رہنماؤں پر' اور ان کی آئندہ سات پشتوں پر جنہوں نے اس خوبصورت پنجاب' اس البیلے' پیارے سنہرے چناب کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے تھے اور اس کی پاکیزہ روح کو گہنا دیا تھا اور اس کے مضبوط جسم میں نفرت کی پیپ بھر دی تھی' آج پنجاب مر گیا تھا۔ اس کے نغمے گنگ ہو گئے تھے۔ اس کے گیت مردہ۔ اس کی زبان مردہ۔ اس کا بے باک نڈر' بھولا بھالا دل مردہ اور نہ محسوس کرتے ہوئے اور آنکھ اور کان نہ رکھتے ہوئے بھی میں نے پنجاب کی موت دیکھی اور خوف سے اور حیرت سے میرے قدم اس پٹڑی پر رک گئے۔

پٹھان مردوں اور عورتوں کی لاشیں اٹھائے جاٹ اور سکھ اور ڈوگرے اور

سرحدی ہندو واپس آئے اور میں آگے چلی۔ آگے ایک نہر آتی تھی ذرا ذرا وقفے کے بعد میں روک دی جاتی۔ جونہی کوئی ڈبہ نہر کے پل پر سے گزرتا لاشوں کو عین نیچے نہر کے پانی میں گرا دیا جاتا۔ اس طرح جب ہر ڈبے کے رکنے کے بعد سب لاشیں پانی میں گرا دی گئیں تو لوگوں نے دیسی شراب کی بوتلیں کھولیں اور میں خون اور شراب اور نفرت کی بھاپ اگلتی ہوئی آگے بڑھی۔

لدھیانہ پہنچ کر لٹیرے گاڑی سے اتر گئے اور شہر میں جا کر انہوں نے مسلمانوں کے محلوں کا پتہ ڈھونڈ نکالا اور وہاں حملہ کیا اور لوٹ مار کی اور مال غنیمت اپنے کاندھوں پر لادے ہوئے تین چار گھنٹوں کے بعد اسٹیشن پر واپس آئے۔ جب تک لوٹ مار نہ ہو چکتی۔ جب تک دس بیس مسلمانوں کا خون نہ ہو چکتا۔ جب تک سب مہاجرین اپنی نفرت کو آلودہ نہ کر لیتے۔ میرا آگے بڑھنا دشوار کیا ناممکن تھا۔ میری روح میں اتنے گھاؤ تھے' اور میرے جسم کا ذرہ ذرہ گندے ناپاک خونیوں کے قہقہوں سے اس طرح رچ گیا تھا کہ مجھے غسل کی شدید ضرورت محسوس ہو رہی تھی' لیکن مجھے معلوم تھا کہ اس سفر میں کوئی مجھے نہانے نہ دے گا۔

انبالہ اسٹیشن پر رات کے وقت میرے ایک فرسٹ کلاس کے ڈبے میں ایک مسلمان ڈپٹی کمشنر اور اس کی بیوی اور بچے سوار ہوئے اسی ڈبے میں ایک سردار صاحب اور ان کی بیوی بھی تھے' فوجیوں کے پہرے میں مسلمان ڈپٹی کمشنر کو گاڑی میں سوار کر دیا گیا اور فوجیوں کو ان کی جان و مال کی سخت تاکید کر دی گئی۔

رات کے دو بجے میں انبالے سے چلی اور دس میل آگے جا کر روک دی گئی' فرسٹ کلاس کا ڈبہ اندر سے بند تھا۔ اس لئے کھڑکی کے شیشے توڑ کر لوگ اندر گئے اور ڈپٹی کمشنر اور اس کی بیوی اور اس کے چھوٹے چھوٹے بچوں کو قتل کیا گیا۔ ڈپٹی کمشنر کی ایک نوجوان لڑکی تھی' اور بڑی خوبصورت وہ کسی کالج میں پڑھتی تھی۔ دو ایک نوجوانوں نے سوچا اسے بچا لیا جائے۔ یہ حسن' یہ رعنائی' یہ تازگی' یہ جوانی کسی کے کام آ سکتی ہے۔ اتنا سوچ کر انہوں نے جلدی سے لڑکی اور زیورات کے بکس کو سنبھالا' اور گاڑی سے اتر کر جنگل میں چلے گئے۔ لڑکی کے ہاتھ میں ایک کتاب تھی۔

یہاں یہ کانفرنس شروع ہوئی۔ لڑکی کو چھوڑ دیا جائے یا مار دیا جائے۔

لڑکی نے کہا، مجھے مارتے کیوں ہو؟ مجھے ہندو کر لو۔ میں تمہارے مذہب میں داخل ہوئی جاتی ہوں۔ تم میں سے کوئی ایک مجھ سے بیاہ کرے میری جان لینے سے فائدہ؟

دوسرے نے قطع کلام کرتے ہوئے اور لڑکی کے پیٹ میں چھرا بھونکتے ہوئے کہا۔ میرے خیال میں اسے ختم کر دینا ہی بہتر ہے۔ چلو گاڑی میں واپس چلو۔ کیا کانفرنس لگا رکھی ہے تم نے۔

لڑکی جنگل میں گھاس کے فرش پر تڑپ تڑپ کر مر گئی، اس کی کتاب اس کے خون سے تربتر ہو گئی، کتاب کا عنوان تھا۔ "اشتراکیت عمل اور فلسفہ از جان سٹریچی" وہ ذہین لڑکی ہو گی۔ اس کے دل میں اپنے ملک و قوم کی خدمت کے ارادے ہوں گے، اس کی روح میں کسی سے محبت کرنے کسی کو چاہنے، کسی کے گلے لگ جانے، کسی بچے کو دودھ پلانے کا جذبہ ہو گا۔ وہ لڑکی تھی، وہ ماں تھی، وہ بیوی تھی، وہ محبوبہ تھی، وہ کائنات کی تخلیق کا مقدس راز تھی اور اب اس کی لاش جنگل میں پڑی تھی، اور گیدڑ اور گدھ اور کوے اس کی لاش کو نوچ کر کھائیں گے۔

اشتراکیت، فلسفہ اور عمل، وحشی درندے انہیں نوچ نوچ کر کھا رہے تھے اور کوئی نہیں بولتا اور کوئی آگے نہیں بڑھتا اور کوئی عوام میں سے انقلاب کا دروازہ نہیں کھولتا۔ اور میں رات کی تاریکی آگ اور شراروں کو چھپا کے آگے بڑھ رہی ہوں اور میرے ڈبوں میں لوگ شراب پی رہے ہیں اور مہاتما گاندی کے جے کارے بلا رہے ہیں۔

ایک عرصے کے بعد میں بمبئی واپس آئی ہوں۔ یہاں مجھے نہلا دھلا کر شیڈ میں رکھ دیا گیا ہے میرے ڈبوں میں اب شراب کے بھپارے نہیں ہیں۔ خون کے چھینٹے نہیں ہیں۔ وحشی خونی قہقہے نہیں ہیں، مگر رات کی تنہائی میں جیسے بھوت جاگ اٹھتے ہیں۔ مردہ روحیں بیدار ہو جاتی ہیں اور زخمیوں کی چیخیں اور عورتوں کے بین اور بچوں کی پکار، ہر طرف فضا میں گونجنے لگتی ہے اور میں چاہتی ہوں کہ اب مجھے کبھی

کوئی اس سفر پر نہ لے جائے۔ میں اس شیڈ سے باہر نہیں نکلنا چاہتی۔ میں اس خوفناک سفر پر دوبارہ نہیں جانا چاہتی۔ اب میں اس وقت جاؤں گی، جب میرے سفر پر دو طرفہ سنہرے گیہوں کے کھلیان لہرائیں گے اور سرسوں کے پھول جھوم جھوم کر پنجاب کے رسیلے الفت بھرے گیت گائیں گے اور کسان ہندو اور مسلمان دونوں مل کر کھیت کاٹیں گے۔ بیج بوئیں گے، ہرے ہرے کھیتوں میں نلائی کریں گے اور ان کے دلوں میں مہرو وفا اور آنکھوں میں شرم اور روحوں میں عورت کے لئے پیار اور محبت اور عزت کا جذبہ ہو گا۔

میں لکڑی کی ایک بے جان گاڑی ہوں۔ لیکن پھر بھی میں چاہتی ہوں کہ اس خون اور گوشت اور نفرت کے بوجھ سے مجھے نہ لادا جائے میں قحط زدہ علاقوں میں اناج ڈھوؤں گی۔ میں کوئلہ اور تیل اور لوہا لے کر میں جاؤں گی۔ میں کسانوں کے لئے نئے ہل اور نئی کھاد مہیا کروں گی، میں اپنے ڈبوں میں کسانوں اور مزدوروں کی خوش حال ٹولیاں لے کر جاؤں گی اور باعصمت عورتوں کی میٹھی نگاہیں اپنے مردوں کا دل ٹٹول رہی ہوں گی اور ان کے آنچلوں میں ننھے ننھے خوبصورت بچوں کے چہرے کنول کے پھولوں کی طرح کھلے نظر آئیں گے، اور وہ اس موت کو نہیں بلکہ آنے والی زندگی کو جھک کر سلام کریں گے۔ جب نہ کوئی ہندو ہو گا نہ مسلمان بلکہ سب مزدور ہوں گے اور انسان ہوں گے!

ایک طوائف کا خط

پنڈت جواہر لال نہرو اور قائد اعظم جناح کے نام

مجھے امید ہے کہ اس سے پہلے آپ کو کسی طوائف کا خط نہ ملا ہو گا۔ یہ بھی امید کرتی ہوں کہ آج تک آپ نے میری اور اس قماش کی دوسری عورتوں کی صورت بھی نہ دیکھی ہو گی۔ یہ بھی جانتی ہوں کہ آپ کو میرا خط لکھنا کس قدر معیوب ہے اور وہ بھی ایسا کھلا خط۔ مگر کیا کروں۔ حالات کچھ ایسے ہیں اور ان دونوں لڑکیوں کا تقاضہ اتنا شدید ہے کہ میں خط لکھے بغیر نہیں رہ سکتی۔ یہ خط میں نہیں لکھ رہی ہوں، یہ خط مجھ سے بیلا اور بتول لکھوا رہی ہیں۔ اس لئے مجھے معاف کیجئے گا۔ ایک گری ہوئی عورت آپ کو اس بے باکی سے خط لکھ رہی ہے۔ میں صدق دل سے معافی چاہتی ہوں۔ اگر میرے خط میں کوئی فقرہ آپ کو ناگوار گزرے۔ اسے میری مجبوری پر محمول کیجئے گا۔

بیلا اور بتول مجھ سے یہ خط کیوں لکھوا رہی ہیں۔ یہ دونوں لڑکیاں کون ہیں اور ان کا تقاضہ اس قدر شدید کیوں ہے۔ یہ سب کچھ بتانے سے پہلے میں آپ کو اپنے متعلق کچھ بتانا چاہتی ہوں۔ گھبرایئے نہیں میں آپ کو اپنی گھناؤنی زندگی کی تاریخ سے آگاہ نہیں کرنا چاہتی۔ میں یہ بھی نہیں بتاؤں گی کہ میں کب اور کن حالات میں طوائف بنی۔ میں کسی شریفانہ جذبے کا سہارا لے کر آپ سے کسی جھوٹے رحم کی درخواست کرنے نہیں آئی ہوں، میں آپ کے دردمندوں کو پہچان کر اپنی صفائی میں

جھوٹا افسانہ محبت نہیں گھڑنا چاہتی۔ اس خط کے لکھنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ کو طوائفیت کے اسرار و رموز سے آگاہ کروں۔ مجھے اپنی صفائی میں کچھ نہیں کہنا ہے۔ میں صرف اپنے متعلق چند ایسی باتیں بتانا چاہتی ہوں جن کا آگے چل کر بیلا اور بتول کی زندگی پر اثر پڑ سکتا ہے۔

آپ لوگ کئی بار بمبئی آئے ہوں گے۔ جناح صاحب نے تو بمبئی کو بہت دیکھا ہے۔ مگر آپ نے ہمارا بازار کاہے کو دیکھا ہو گا۔ جس بازار میں میں رہتی ہوں' وہ فارس روڈ کہلاتا ہے' فارس روڈ' گرانٹ روڈ اور مدن پورہ کے بیچ میں واقع ہے۔ گرانٹ روڈ کے اس پار لمنگٹن روڈ اور اوپیرا ہاؤس اور چوپاٹی۔ میرین ڈرائیو اور فورٹ کے علاقے ہیں۔ جہاں بمبئی کے شرفا رہتے ہیں۔ مدن پورہ میں اس طرف غریبوں کی بستی ہے۔ فارس روڈ ان دونوں کے بیچ میں ہے۔ تاکہ امیر اور غریب اس سے یکساں مستفید ہو سکیں۔ گو فارس روڈ پھر بھی مدنپورہ کے زیادہ قریب ہے۔ کیونکہ ناداری میں اور طوائفیت میں ہمیشہ بہت کم فاصلہ رہتا ہے۔

یہ بازار بہت خوبصورت نہیں ہے۔ اس کے مکین بھی خوبصورت نہیں ہے۔ اس کے بیچوں بیچ ٹرام کی گڑگڑاہٹ شب و روز جاری رہتی ہے جہان بھر کے آوارہ کتے اور لونڈے اور شہدے اور بے کار اور جرائم پیشہ مخلوق اس کی گلیوں کا طوائف کرتی نظر آتی ہے۔ لنگڑے' لولے' اوباش' مدقوق تماشبین' آتشک و سوزاک کے مارے ہوئے' کانے' گنجے' کوکین باز اور جیب کترے اس بازار میں سینہ تان کر چلتے ہیں۔ غلیظ ہوٹل۔ سیلے ہوئے فٹ پاتھ پر میلے کے ڈھیروں پر بھنبھناتی ہوئی لاکھوں مکھیاں۔ لکڑیوں اور کوئلوں کے افسردہ گودام۔ پیشہ وردلال' اور باسی ہار بیچنے والے۔ سینما کی تصویروں کی گلی سڑی کتابیں بیچنے والے۔ کوک شاستر اور ننگی تصویروں کے دکان دار' چینی حجام اور اسلامی حجام اور لنگوٹے کس کر گالیاں بکنے والے پہلوان' ہماری سماجی زندگی کا سارا کوڑا کرکٹ آپ کو فارس روڈ پر ملتا ہے۔ ظاہر ہے آپ یہاں کیوں آئیں گے۔ کوئی شریف آدمی ادھر کا رخ نہیں کرتا۔ شریف آدمی جتنے ہیں وہ گرانٹ روڈ کے اس پار رہتے ہیں اور جو بہت ہی شریف ہیں وہ ملبار ہل پر قیام

کرتے ہیں۔ میں ایک بار جناح صاحب کی کوٹھی کے سامنے سے گزری تھی اور وہاں میں نے جھک کر سلام بھی کیا تھا۔ بتول بھی میرے ساتھ تھی۔ بتول کو آپ سے (جناح صاحب) جس قدر عقیدت ہے اس کو میں کبھی ٹھیک طرح سے بیان نہ کر سکوں گی۔ خدا اور رسول کے بعد دنیا میں اگر وہ کسی کو چاہتی ہے تو وہ صرف آپ ہیں۔ اس نے آپ کی تصویر لاکٹ میں لگا کر اپنے سینہ سے لگا رکھی ہے۔ کسی بری نیت سے نہیں۔ بتول کی عمر ابھی گیارہ برس کی ہے۔ چھوٹی سی لڑکی ہی تو ہے وہ۔ گو فارس روڈ والے ابھی سے اس کے متعلق برے برے ارادے کر رہے ہیں مگر۔ خیر وہ کبھی پھر آپ کو بتاؤں گی۔

تو یہ ہے فارس روڈ جہاں میں رہتی ہوں۔ فارس روڈ کے مغربی سرے پر جہاں چینی حجام کی دکان ہے۔ اس کے قریب ایک اندھیری گلی کے موڑ پر میری دکان ہے۔ لوگ تو اسے دکان نہیں کہتے، مگر خیر آپ دانا ہیں آپ سے کیا چھپاؤں گی۔ یہی کہوں گی۔ وہاں پر میری دکان ہے اور وہاں پر میں اس طرح بیوپار کرتی ہوں جس طرح بنیا، سبزی والا، پھل والا، ہوٹا والا، موٹر والا، سینما والا، کپڑے والا یا کوئی اور دکان دار بیوپار کرتا ہے اور ہر بیوپار میں گاہک کو خوش کرنے کے علاوہ اپنے فائدہ کی بھی سوچتا ہے۔ میرا بیوپار بھی اسی طرح کا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ میں بلیک مارکیٹ نہیں کرتی اور مجھ میں اور دوسرے بیوپاریوں میں کوئی فرق نہیں۔

یہ دکان اچھی جگہ پر واقع نہیں ہے۔ یہاں رات تو کیا دن کو بھی لوگ ٹھوکر کھا جاتے ہیں۔ اس اندھیری گلی میں لوگ اپنی جیبیں خالی کر کے جاتے ہیں۔ شراب پی کر قے کرتے ہیں۔ جہاں بھر کی گالیاں بکتے ہیں۔ یہاں بات بات پر چھرا زنی ہوتی ہے۔ دو ایک خون دوسرے تیسرے روز ہوتے رہتے ہیں۔ غرضیکہ ہروقت جان ضیق میں رہتی ہے اور پھر میں کوئی بہت اچھی طوائف نہیں ہوں، کہ پون ہل پر جا کے رہوں یا ورلی پر سمندر کے کنارے ایک کوٹھی لے سکوں۔ میں ایک بہت ہی معمولی درجے کی طوائف ہوں اور گو میں نے سارا ہندوستان دیکھا ہے اور گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے اور ہر طرح کے لوگوں کی صحبت میں بیٹھی ہوں۔ لیکن اب دس سال سے اسی شہر بمبئی

میں ۔ اسی فارس روڈ پر اسی دکان میں بیٹھی ہوں' اور اب تو مجھے اس دکان کی پگڑی بھی چھ ہزار روپے تک ملتی ہے۔ حالانکہ یہ جگہ کوئی اتنی اچھی نہیں۔ فضا متعفن ہے۔ کیچڑ چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے۔ گندگی کے انبار لگے ہیں اور خارش زدہ کتے گھبرائے ہوئے گاہوں کی طرف کاٹ کھانے کو لپکتے ہیں۔ پھر بھی مجھے اس جگہ کی پگڑی چھ ہزار روپے تک ملتی ہے۔

اس جگہ میری دکان ایک منزلہ مکان میں ہے۔ اس کے دو کمرے ہیں۔ سامنے کا کمرہ میری بیٹھک ہے۔ یہاں میں گاتی ہوں' ناچتی ہوں' گاہکوں کو رجھاتی ہوں' پیچھے کا کمرہ باورچی خانے اور غسل خانے اور سونے کے کمرے کا کام دیتا ہے۔ یہاں ایک طرف نل ہے۔ ایک طرف چولہا ہنڈیا ہے اور ایک طرف ایک بڑا سا پلنگ ہے جس کے نیچے ایک اور چھوٹا سا پلنگ ہے اور اس کے نیچے میرے کپڑوں کے صندوق ہیں۔ باہر والے کمرے میں بجلی کی روشنی ہے لیکن اندر والے کمرے میں بالکل اندھیرا ہے۔ مالک مکان نے برسوں سے قلعی نہیں کرائی نہ وہ کرائے گا۔ اتنی فرصت کسے ہے۔ میں تو رات بھر ناچتی گاتی ہوں اور دن کو وہیں گاؤ تکئے سے سر ٹیک کر سو جاتی ہوں۔ بیلا اور بتول کو پیچھے کا کمرہ دے رکھا ہے' اکثر گاہک جب اس طرف منہ ہات دھونے کے لئے جاتے ہیں۔ تو بیلا اور بتول پھٹی پھٹی نگاہوں سے انہیں دیکھنے لگ جاتی ہیں۔ جو کچھ ان کی نگاہیں کہتی ہیں۔ میرا یہ خط بھی وہی کہتا ہے۔ اگر وہ میرے پاس اس وقت نہ ہوتیں تو یہ گناہگار بندی آپ کی خدمت میں یہ گستاخی نہ کرتی۔ جانتی ہوں دنیا مجھ پر تھو تھو کرے گی۔ جانتی ہوں شاید آپ تک میرا یہ خط بھی نہ پہنچے گا۔ پھر بھی مجبور ہوں۔ یہ خط لکھ کے رہوں گی کہ بیلا اور بتول کی مرضی یہی ہے۔

شاید آپ قیاس کر رہے ہوں گے کہ بیلا اور بتول میری لڑکیاں ہیں۔ نہیں یہ غلط ہے' میری کوئی لڑکی نہیں ہے۔ ان دونوں لڑکیوں کو میں نے بازار سے خریدا ہے۔ جن دنوں ہندو مسلم فساد زوروں پر تھا اور گرانٹ روڈ اور فارس روڈ اور مدن پورہ پر انسانی خون پانی کی طرح بہایا جا رہا تھا۔ ان دنوں میں نے بیلا کو ایک مسلمان دلال سے تین سو روپے کے عوض خریدا تھا۔ یہ مسلمان دلال اس لڑکی کو دہلی سے لایا تھا۔

جہاں بیلا کے ماں باپ رہتے تھے۔ بیلا کے ماں باپ راولپنڈی میں راجہ بازار کے عقب میں پونچھ ہاؤس کے سامنے کی گلی میں رہتے تھے۔ متوسط طبقے کا گھرانہ تھا۔ شرافت اور سادگی گھٹی میں پڑی تھی۔ بیلا اپنے ماں باپ کی اکلوتی بیٹی تھی اور جب راولپنڈی میں مسلمانوں نے ہندوؤں کو تہ تیغ کرنا شروع کیا۔ اس وقت چوتھی جماعت میں پڑھتی تھی۔ یہ بارہ جولائی کا واقعہ ہے۔ بیلا اپنے اسکول سے پڑھ کے گھر آ رہی تھی کہ اس نے اپنے گھر کے سامنے اور دوسرے ہندوؤں کے گھروں کے سامنے ایک جم غفیر دیکھا۔ یہ لوگ مسلح تھے اور گھروں کو آگ لگا رہے تھے اور لوگوں کو اور ان کے بچوں کو اور ان کی عورتوں کو گھر سے باہر نکال کر انہیں قتل کر رہے تھے۔ ساتھ ساتھ اللہ اکبر کا نعرہ بھی بلند کرتے جاتے تھے۔ بیلا نے اپنی آنکھوں سے اپنے باپ کو قتل ہوتے ہوئے دیکھا۔ پھر اس نے اپنی آنکھوں سے اپنی ماں کو دم توڑتے ہوئے دیکھا۔ وحشی مسلمانوں نے اس کے پستان کاٹ کے پھینک دیئے تھے۔ وہ پستان جن سے ایک ماں' کوئی ماں' ہندو ماں یا مسلمان ماں' عیسائی ماں یا یہودی ماں۔ اپنے بچے کو دودھ پلاتی ہے اور انسانوں کی زندگی میں کائنات کی وسعت میں تخلیق کا ایک نیا باب کھولتی ہے۔ وہ دودھ بھرے پستان اللہ اکبر کے نعروں کے ساتھ کاٹ ڈالے گئے۔ کسی نے تخلیق کے ساتھ اتنا ظلم کیا تھا۔ کس ظالم اندھیرے نے ان کی روحوں میں یہ سیاہی بھر دی تھی۔ میں نے قرآن پڑھا ہے۔ اور میں جانتی ہوں کہ راولپنڈی میں بیلا کے ماں باپ کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ اسلام نہیں تھا وہ انسانیت نہ تھی۔ وہ دشمنی بھی نہ تھی۔ وہ انتقام بھی نہ تھا۔ وہ ایک ایسی شقاوت' بے رحمی' بزدلی اور شیطنیت تھی جو تاریکی کے سینے سے پھوٹتی ہے اور نور کی آخری کرن کو بھی داغدار کر جاتی ہے۔

بیلا اب میرے پاس ہے۔ مجھ سے پہلے وہ داڑھی والے مسلمان دلال کے پاس تھی اور اس سے پہلے وہ دہلی والے مسلمان کے پاس تھی۔ بیلا کی عمر بارہ سال سے زیادہ نہیں تھی۔ جب وہ چوتھی میں پڑھتی تھی اپنے گھر میں ہوتی تو آج پانچویں جماعت میں داخل ہو رہی ہوتی۔ پھر بڑی ہوتی تو اس کے ماں باپ اس کا بیاہ کسی شریف گھرانے کے غریب لڑکے سے کر دیتے وہ اپنا چھوٹا سا گھر بساتی' اپنے خاوند سے

اپنے ننھے ننھے بچوں سے، اپنی گھریلو زندگی کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں سے پیار کرتی لیکن اس نازک سی کلی کو بے وقت خزاں آ گئی۔ اب بیلا بارہ برس کی نہیں معلوم ہوتی۔ اس کی عمر تھوڑی ہے۔ لیکن اس کی زندگی بہت بوڑھی ہے۔ اس کی آنکھوں میں جو ڈر ہے۔ انسانیت کی جو تلخی ہے یا اس کا جو لہو ہے۔ موت کی جو پیاس ہے۔ قائد اعظم صاحب شاید اگر آپ اسے دیکھ سکیں تو اس کا اندازہ کر سکیں۔ اس بے آسرا آنکھوں کی گہرائیوں میں اتر سکیں۔ آپ تو شریف آدمی ہیں۔ آپ نے شریف گھرانوں کی معصوم لڑکیوں کو دیکھا ہو گا۔ ہندو لڑکیوں کو، مسلمان لڑکیوں کو، شاید آپ سمجھ جاتے کہ معصومیت کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ وہ ساری انسانیت کی امانت ہے۔ ساری دنیا کی میراث ہے جو اسے مٹاتا ہے اسے دنیا کے کسی مذہب کا کوئی خدا معاف نہیں کر سکتا۔

بتول اور بیلا دونوں سگی بہنوں کی طرح میرے ہاں رہتی ہیں بتول اور بیلا سگی بہنیں ہیں نہیں۔ بتول مسلمان لڑکی ہے۔ بیلا نے ہندو گھر میں جنم لیا ہے۔ آج دونوں فارس روڈ پر ایک رنڈی کے گھر میں بیٹھی ہیں۔ اگر بیلا راولپنڈی سے آئی ہے تو بتول جالندھر کے ایک گاؤں کھیم کرن کے ایک پٹھان کی بیٹی ہے۔ بتول کے باپ کی سات بیٹیاں تھیں۔ تین شادہ شدہ اور چار کنواریاں۔ بتول کا باپ کھیم کرن میں ایک معمولی کاشتکار تھا۔ غریب پٹھان۔ لیکن غیور پٹھان جو صدیوں سے کھیم کرن میں آ کے بس گیا تھا۔ جاٹوں کے اس گاؤں میں یہی تین چار گھر پٹھانوں کے تھے۔ یہ لوگ جس حلم و آشتی سے رہتے تھے شاید اس کا اندازہ پنڈت جی آپ کو اس امر سے ہو گا کہ مسلمان ہونے پر بھی ان لوگوں کو اپنے گاؤں میں مسجد بنانے کی اجازت نہیں تھی، یہ لوگ گھر میں چپ چاپ اپنی نماز ادا کرتے، صدیوں سے جب سے مہاراجہ رنجیت سنگھ نے عنان حکومت سنبھالی تھی۔ کسی مومن نے اس گاؤں میں اذان نہ دی تھی، ان کا دل عرفان سے روشن تھا۔ لیکن دنیاوی مجبوریاں اس قدر شدید تھیں اور پھر رواداری کا خیال اس قدر غالب تھا کہ لب وا کرنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔

بتول اپنے باپ کی چہیتی لڑکی تھی۔ سات میں سب سے چھوٹی۔ سب سے پیاری،

سب سے حسین، بتول اس قدر حسین ہے کہ ہاتھ لگانے سے میلی ہوتی ہے۔ پنڈت جی آپ تو خود کشمیری النسل ہیں۔ اور فن کار ہو کر یہ بھی جانتے ہیں کہ خوبصورتی کسے کہتے ہیں۔ یہ خوبصورتی آج میری گندگی کے ڈھیر میں گڈ مڈ ہو کر اس طرح پڑی ہے کہ اس کی پرکھ کرنے والا کوئی شریف آدمی اب مشکل سے ملے گا۔ اس گندگی میں گلے، سڑے مارواڑی، گھنی مونچھوں والے ٹھیکدار، ناپاک نگاہوں والے چور بازاری ہی نظر آتے ہیں۔ بتول بالکل ان پڑھ ہے۔ اس نے صرف جناح صاحب کا نام سنا تھا۔ پاکستان کو ایک اچھا تماشہ سمجھ کر اس نے نعرے لگائے تھے جیسے تین چار برس کے ننھے بچے گھر میں "انقلاب جندہ باد" کرتے پھرتے ہیں۔ گیارہ برس ہی کی تو وہ ہے۔

ان پڑھ بتول۔ وہ چند دن ہی ہوئے میرے پاس آئی ہے۔ ایک ہندو دلال اسے میرے پاس لایا تھا۔ میں نے اسے پانسو روپے میں خرید لیا۔ اس سے پہلے وہ کہاں تھی۔ یہ میں نہیں کہہ سکتی، ہاں لیڈی ڈاکٹر نے مجھ سے بہت کچھ کہا ہے، کہ اگر آپ اسے سن لیں تو شاید پاگل ہو جاویں۔ بتول بھی اب نیم پاگل ہے اس کے باپ کو جاٹوں نے اس بیدردی سے مارا ہے کہ ہندو تہذیب کے پچھلے چھ ہزار برس کے چھلکے اتر گئے ہیں اور انسانی بربریت اپنے وحشی ننگے روپ میں سب کے سامنے آگئی ہے۔ پہلے تو جاٹوں نے اس کی آنکھیں نکالیں۔ پھر اس کے منہ میں پیشاب کیا۔ پھر اس کے حلق کو چیر کے اس کی آنتیں تک نکال ڈالیں۔ پھر اس کی شادی شدہ بیٹیوں سے زبردستی منہ کالا کیا۔ اسی وقت ان کے باپ کی لاش کے سامنے ریحانہ، گل درخاص، مرجانہ، سوسن، بیگم، ایک ایک کر کے وحشی انسان نے اپنے مندر کی عورتوں کو ناپاک کیا۔ جس نے انہیں زندگی عطا کی جس نے انہیں لوریاں سنائی تھیں۔ جس نے ان کے سامنے شرم سے اور عجز سے اور پاکیزگی سے سر جھکایا تھا۔ ان تمام بہنوں، بہنوں اور ماؤں کے ساتھ زنا کیا۔ ہندو دھرم نے اپنی عزت کھو دی تھی۔ اپنی رواداری تباہ کر دی تھی۔ اپنی عظمت مٹا ڈالی تھی۔ آج رگ وید کا ہر منتر خاموش تھا۔ آج گرنتھ صاحب کا ہر دوہا شرمندہ تھا۔ آج گیتا کا ہر اشلوک زخمی تھا۔ کون ہے جو میرے سامنے

اجنتا کی مصوری کا نام لے سکتا ہے۔ اشوک کے کتبے سنا سکتا ہے۔ ایلورا کے صنم زاروں کے گن گا سکتا ہے۔ بتول کے بے بس بھینچے ہوئے ہونٹوں۔ اس کی بانہوں' پر وحشی درندوں کے دانتوں کے نشان اور اس کی بھری ہوئی ٹانگوں کی ناہمواری میں تمہاری جنتا کی موت ہے۔ تمہارے ایلورا کا جنازہ ہے۔ تمہاری تہذیب کا کفن ہے۔ آؤ۔ آؤ۔ میں تمہیں اس خوبصورتی کو دکھاؤں جو کبھی بتول تھی۔ اس متعفن لاش کو دکھاؤں جو آج بتول ہے۔

جذبے کی رو میں بہہ کر میں بہت کچھ کہہ گئی' شاید یہ سب کچھ مجھے نہ کہنا چاہیے تھا۔ شاید اس میں آپ کی ہتک ہے۔ شاید اس سے زیادہ ناگوار باتیں آپ سے اب تک کسی نہ نہ کہی ہوں نہ سنائی ہوں گی شاید آپ یہ سب کچھ نہیں کر سکتے۔ بلکہ شاید تھوڑا بہت بھی نہیں کر سکتے' پھر بھی ہمارے ملک میں آزادی آ گئی ہے۔ ہندوستان میں اور پاکستان میں اور شاید ایک طوائف کو بھی اپنے رہنماؤں سے پوچھنے کا یہ حق ضرور ہے کہ اب بیلا اور بتول کا کیا ہو گا......؟؟

بیلا اور بتول دو لڑکیاں ہیں۔ دو قومیں ہیں۔ دو تہذیبیں ہیں۔ دو مندر اور مسجد ہیں اور بتول آج کل فارس روڈ میں ایک رنڈی کے ہاں رہتی ہے۔ جو چینی حجام کی بغل میں اپنی دکان کا دھندا چلاتی ہے۔ بیلا اور بتول کو یہ دھندا پسند نہیں۔ میں نے انہیں خریدا ہے۔ میں چاہوں تو ان سے یہ کام لے سکتی ہوں۔ لیکن میں سوچتی ہوں۔ میں یہ کام نہیں کروں گی' جو راولپنڈی اور جالندھر نے ان سے کیا ہے۔ میں نے انہیں اب تک دنیا کو فارس روڈ کی دنیا سے الگ تھلگ رکھا ہے۔ پھر بھی جب میرے گاہک پچھلے کمرے میں جا کر اپنا منہ ہاتھ دھونے لگتے ہیں۔ اس وقت بیلا اور بتول کی نگاہیں مجھ سے کچھ کہنے لگتی ہیں۔ مجھے ان نگاہوں کی تاب نہیں میں ٹھیک طرح سے ان کا سندیسہ بھی آپ تک نہیں پہنچا سکتی' آپ کیوں نہ خود ان نگاہوں کا پیغام پڑھ لیں۔ پنڈت جی میں چاہتی ہوں کہ آپ بتول کو اپنی بیٹی بنا لیں۔ جناح صاحب میں چاہتی ہوں کہ آپ بیلا کو اپنی دختر نیک اختر سمجھیں۔ ذرا ایک دفعہ انہیں اس فارس روڈ کے چنگل سے چھڑا کے اپنے گھر میں رکھیئے اور ان لاکھوں روحوں کا

نوحہ سنئے، یہ نوحہ جو نواکھالی سے راولپنڈی تلک اور بھرت پور سے بمبئی تک گونج رہا ہے۔ کیا صرف گورنمنٹ ہاؤس میں اس کی آواز سنائی نہیں دیتی، یہ آواز سنیں گے آپ؟

آپ کی مخلص
فارس روڈ کی ایک طوائف

جیکسن

رات جوان تھی اور یخ کی طرح سرد اور سخت' سڑک بھی سخت تھی۔ اور جیکسن کے بھاری جوتوں کی چاپ بھی سخت تھی' اور سڑک کے دو رویہ درخت بھی پولیس کے سنتریوں کی طرح اکڑے ہوئے کھڑے نظر آ رہے تھے۔ اسی رات میں۔ اسی آسمان تلے' اسی سڑک کے آر پار' ہر چیز سخت' واضح اور متعین تھی' مثال کے طور پر جیکسن کو معلوم تھا کہ وہ شہر لاہور کا ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس ہے' جس سڑک پر وہ چل رہا ہے۔ وہ امپریس روڈ کہلاتی ہے۔ وہ کلب سے چھ پیگ پی کر چھڑی گھماتا ہوا اپنے بنگلے کو جا رہا ہے۔ پولیس کے چار سپاہی اس کے عقب میں آ رہے ہیں۔ تاکہ کوئی اس پر حملہ نہ کر بیٹھے خود اس کی جیب میں ایک بھرا ہوا پستول ہے۔ اس نے اس ملک میں بیس سال نوکری کی ہے اور اب پندرہ اگست ۱۹۴۷ء میں صرف چار روز باقی رہ گئے ہیں۔ جب یہ ملک آزاد ہو جائے گا اور جیکسن کی بادشاہت اس سے چھن جائے گی۔

جیکسن گو اینگلو انڈین تھا۔ لیکن پھر بھی وہ اپنے آپ کو صرف انگریز ہی سمجھتا تھا۔ اس لئے بادشاہت چھن جانے کا اسے بے حد ملال تھا۔ اس نے اس ملک میں بیس سال بادشاہت کی تھی۔ اس دو سو سال کی شہنشاہت میں بیس سال کے سامراجی اقتدار کا ایک حصہ اس کی زندگی میں بھی آیا تھا۔ وہ پنجاب کے ہر ضلع میں رہ چکا تھا اور ہر ضلع میں ایک بنگلہ آٹھ نوکر بیسیوں تھانے اور حوالدار اور انسپکٹر اور سپاہی اور ہزاروں' لاکھوں افراد پر مشتمل مخلوق اس کے تصرف میں ہوتی تھی۔ بیس سال تک

اس نے اس ملک میں بادشاہت کی تھی اور اب پندرہ اگست کو یہ بادشاہت ختم ہو جائے گی۔ یہ تاریخ اس کے حافظے میں اس طرح گڑی ہوئی تھی۔ جیسے اس کے بھاری بھرکم جوتے کے تلوے میں لوہے کی کیل۔ یا جیسے رات کی سیاہ آہنی چادر میں نیلے ستارے، آج ہر چیز سخت واضح اور متعین تھی۔ اپنی جگہ پر ٹھوس اور قائم بالذات، اس کا فیصلہ بھی اتنا ہی سخت، ٹھوس اور اپنی جگہ پر اٹل تھا۔ وہ یہاں دو سال اور ملازمت کرے گا۔ پھر اپنے وطن انگلستان کو لوٹ جائے گا۔ ہندوستان اس کا وطن نہ تھا۔ اس نے نہایت سختی سے اپنے دل و دماغ کو یہ بات جتا دی کہ وہ ہندوستانی نہیں ہے۔ وہ صرف انگریز ہے۔ اور اسے انگلستان واپس جانا ہے اور اس کے دل و دماغ نے پولیس کے سنتریوں کی طرح اس کے حکم کی تعمیل کی تھی۔ اب وہ دو سال کے بعد انگلستان واپس چلا جائے گا۔ اس نے یارک شائر میں ایک کاٹیج اور ایک ڈیری فارم بھی خرید لیا ہے۔ اب دو سال کے بعد وہ پنشن لے کر یارک شائر میں اپنی بیوی اور دو لڑکیوں کے ساتھ رہے گا۔ نہ کوئی جھنجھٹ نہ تکلیف نہ مصیبت۔ اس کی بیوی بھی اور دو لڑکیاں، بڑی کا نام ستھیا تھا اور چھوٹی کا روزی۔ اور دونوں برٹ کے ناچ گھر کی زینت سمجھی جاتی تھیں۔ کئی اینگلو انڈین لڑکوں نے شادی کی درخواست کی۔ لیکن لڑکیوں نے انکار کر دیا۔ وہ تو صرف خالص انگریز سے شادی کریں گی، اور وہ بھی اچھے گھرانے کے کسی انگریز سے۔ یہ ٹامی وامی بھی انہیں پسند نہ تھے۔ نہ وہ دوسری اینگلو انڈین چھوکریوں کی طرح ان کے ساتھ گھومتی تھیں۔ اپنے خیالات میں اپنے اطوار میں اور اپنے عمل میں دونوں لڑکیاں اپنے باپ کی طرح سخت اور برفیلی تھیں اور باپ کو اس کا علم تھا اور جیکسن کو اپنی لڑکیوں سے جتنی محبت تھی اتنی شاید اسے اپنی بادشاہت سے بھی نہ تھی۔ بالخصوص روزی کو تو وہ بہت چاہتا تھا۔ روزی اتنی خوبصورت تھی کہ انگلستان کے کسی بڑے لارڈ سے بیاہے جانے کے قابل تھی۔ ناچنے میں ہمیشہ اول نمبر کا انعام حاصل کرتی۔ مقابلہ حسن میں ہمیشہ ملکہ چنی جاتا۔ اپنی جماعت میں سب لڑکیوں سے زیادہ نمبر حاصل کرتی۔ گانے میں پیانو بجانے میں۔ تصویر کشی میں، موٹر چلانے میں اسے کمال حاصل تھا۔ یہ سب اوصاف ستھیا میں بھی موجود

تھے جو روزی کی بڑی بہن تھی۔ لیکن ذرا کم' ذرا ناصاف' ذرا کھردرے سے' قدرتی جوہر میں جو ایک فطری چمک اور جلا ہوتی ہے۔ اس سے ستھیا محروم تھی' ہاں ایک بات میں وہ روزی سے کم نہیں زیادہ ہی آگے تھی' یعنی ہندوستانیوں سے نفرت کرنے میں۔ روزی کو ہندوستانیوں سے ایسے ہی نفرت تھی۔ ایک لاابالی انجان سی نفرت جیسے اسے مچھلی کھانے سے نفرت تھی۔ یونہی یا اس نے جیسے بائبل میں شیطان کے بارے میں پڑھا تھا۔ اسی طرح اس کے ابا اور امی نے اسے ہندوستانیوں کے بارے میں بتایا تھا۔ اسے بسا اوقات ہندوستانی شیطان کی طرح دلچسپ معلوم ہوتے' وہ ان کے متعلق اپنے والد سے قصے سنا کرتی۔ یہ قصے اس کے لئے الف لیلہ سے کم پراسرار نہ تھے' ڈاکوؤں کے قصے' جانوں کی خونریزی کے قصے' عورتوں کو بھگا لے جانے کے افسانے' جیب کترنے' چوری کرنے اور ناجائز شراب کشید کرنے کے قصے۔ ہندوستانی افسر جو رشوت لیتے تھے' اور ہندوستانی سیٹھ جو نفع اندوزی اور چور بازار کا دھندا چلاتے تھے۔ روزی کو بڑی حیرت ہوتی تھی' یہ باتیں سن کر اس کی زندگی' اسکول اور برٹ کے ناچ گھر اور پک نک اور ٹینس تک محدود تھی' اس میں خوبصورت لڑکے لڑکیاں تھے۔ جوانی کی اچھل کود تھی' ٹینس کے تھرکتے ہوئے گیند تھے' اور کبھی کبھی چاندنی راتوں میں برٹ کے سایہ دار گھنے درختوں تلے چلتے چلتے کمر میں ہاتھ ڈال کر سانس روک کر ایسے پیارے لطیف بوسے تھے جو صرف چاندنی سے بنے تھے۔ صرف جنت سے آئے تھے اور شہد کی سی حلاوت رکھتے تھے' اور دوسرے لمحے میں تیتری کی طرح فضا میں گم ہو جاتے تھے' صرف ان کی خوشبو باقی رہتی تھی' اور دیر تک دماغ کی تہوں میں تیرتی رہتی تھی' یہ زندگی ہندوستان کی زندگی سے کس قدر مختلف تھی' کبھی کبھی نفرت کرتے ہوئے بھی روزی کا جی چاہتا کہ وہ کسی ہندوستانی سے بات کرے۔ بات کرنے کو تو یوں اسے کئی ہندوستانی ملے تھے لیکن وہ سب اینگلو انڈین تہذیب کے نقال تھے اور روزی کو نقلی چیزیں پسند نہ تھیں۔ بلکہ وہ لوگ تو اسے اور بھی برے لگتے اور وہ ایک سرسری ملاقاتوں کے بعد ان سے ہیلو تک کی واقفیت بھی نہ رکھتی تھی' اور ستھیا تو اتنی راسخ الاعتقاد تھی کہ آج تک کسی ہندوستانی مرد کے ساتھ وہ ناچی بھی نہ تھی' اور

اس قدر محتاط تھی وہ کہ کوئی یہ نہیں سکتا تھا کہ اس کے دور پار کے دوستوں کے دوستوں میں بھی کوئی ایک ہندوستانی ہو گا۔ اسے اپنے اینگلو انڈین ہونے کا شدید احساس تھا اور اپنے کھلتے ہوئے صبیح حسن کے باوجود جب اسے یورپین لوگ اینگلو انڈین سمجھتے' تو وہ اپنے مقدس اینگلو سکسن خون میں ہندوستانی ملاوٹ کو صلواتیں سنانے لگتی' یہ کمبخت ہندوستانی ہر چیز میں ملاوٹ کرتے ہیں۔ دودھ میں' شکر میں' گھی میں' کپڑے میں' اناج میں' ہر چیز میں ملاوٹ' حتی کہ ستھیا کے خون میں بھی انہوں نے یہ گندی ملاوٹ کر دی تھی۔ ڈیم سوائنس.....

جیکسن نے اپنی بیٹیوں کو اعلیٰ تربیت دی تھی' اور برے ماحول سے بچا بچا کے اس لئے رکھا تھا کہ وہ انگلینڈ کے لئے محفوظ ہیں' اور ان کے رکھ رکھاؤ میں اسی جانچ پڑتال سے کام لیتا تھا جس طرح وہ دوسرے سامراجی کاموں میں' یعنی انگلینڈ کا فائدہ ہر حالت میں ملحوظ خاطر رہے یہ لڑکیاں اس کے لئے فلسطین کے مینڈیت سے کم نہیں تھیں اور اپنے ذہن کی تختی پر اس نے اپنی دونوں بیٹیوں کے بارے میں نہایت جلی حروف سے Reserved for England کے لئے محفوظ لکھ رکھا تھا۔ وہ جب بھی اپنی بیٹیوں سے بات کرتا یا انہیں دیکھتا۔ یا ان کے متعلق سوچتا۔ تو تختی پہ یہ حروف اس کے دماغ میں یوں چمکنے لگتے' جیسے رات کے اندھیروں میں پٹرول پمپ کا کا ٹیکس کا اشتہار بجلی کے قمقمے روشن ہوتے گل ہو جانے روشن ہوتے گل ہو جاتے Reserved.for.England اندھیرا Reserved for England اجالا اس وقت بھی جیکسن اپنے اور اپنی بیٹیوں اور اپنے یارک شائر کے خوبصورت گھر کے بارے میں پختہ ارادے باندھتا ہوا امپریس روڈ سے جا رہا تھا۔ ہوا خنک تھی' سڑک سنسان تھی' معدے میں چھ پیگ تھے' اور جیکسن کے مضبوط قدموں کی چاپ تھی' اور جیکسن کے رخسار تمتمائے ہوئے تھے' اور وہ شراب کی حدت کو اپنے دل میں اور اپنے رخساروں پر اور اپنی آنکھ کی پتلیوں میں محسوس کر سکتا تھا۔ چلتے چلتے اس کے قدم رک گئے' یہاں لڑکیوں کا کالج تھا اور ایک استانی سے اس کی آشنائی تھی۔ کرسچین استانی بڑی پرفن تھی' اس نے سوچا کہ وہ سپاہیوں کو لے کر کالج کے احاطے میں چلا جائے اور

کالج کے ملحق بنگلے میں پہنچ جائے' اور پھر اس استانی کو جگا دے۔ پھر وہ مسکرا اٹھا غلط ہے اسے گھر جانا ہے۔ وہ آگے چلنے لگا اور موڑ کو پار کر کے وہ آل انڈیا ریڈیو کی عمارت سے آگے نکل کر اپنی کوٹھی میں داخل ہو گیا۔ دروازے پر کھڑے ہوئے سنتریوں نے اسے سلامی دی اور پھر تھوڑی دیر بعد اس کے عقب میں چلتے ہوئے سپاہی اس کے بنگلے کے دروازے تک آئے اور سلامی دے کر واپس ہو گئے۔ اس وقت جیکسن اندر جا چکا تھا۔ لیکن سلامی سپاہیوں کے لئے پھر بھی ضروری تھی۔

جیکسن اندر پہنچا تو بیرے نے آہستہ سے کہا۔ "وہ آ گئے ہیں حضور۔"

کہاں بٹھایا ہے انہیں؟

بیرے نے اشارے سے کہا۔ مہاشے نہال چند کھوکھری تو سرکار کے دفتر میں بیٹھے ہیں۔ مولانا اللہ داد پیرزادہ کو ڈرائنگ روم میں بٹھایا ہے۔ سرکار پہلے کسے خبر کروں۔

جیکسن نے کہا۔ "تم پیرزادہ صاحب کو پیگ و یگ دو' میں مہاشے سے بات کرتا ہوں۔"

مہاشے نہال چند کھوکھری لاہور کے ہندوؤں کے ممتاز لیڈر تھے۔ غریب ہندوؤں کا بھلا چاہتے تھے' تین اخباروں' چار کوٹھیوں اور گجرانوالہ میں دس ہزار ایکڑ زمین کے مالک تھے' ان کا بڑا بیٹا انٹرنیشنل بنک کا مینجر تھا' اور چھوٹا کانگریس ایم۔ ایل۔ اے۔ ان کا داماد ہندو مہاسبھا کا سیکرٹری تھا۔ اور وہ خود ویدانتی سوشلسٹ تھے' یعنی انہوں نے اپنے فائدے کے لئے مستقبل پر نگاہ رکھتے ہوئے چاروں کھونٹوں پر قبضہ کر رکھا تھا اور اونٹ کی ہر کروٹ کا خیال رکھا تھا۔ لیکن مشکل یہ آن پڑی تھی کہ ان دنوں ہندو مسلم فساد بڑے زوروں پر تھا اور ان کا کوئی رشتہ دار مسلمان نہ تھا۔ نہ ہو خود کسی مصلحت سے مسلمان ہو سکتے تھے اور اتنی دور اور لمبی بات ان کے ذہن میں بھی نہ آئی تھی' کہ پنجاب یوں آزادی کی بنا پر تقسیم ہو گا۔ اور ان کا خوبصورت شہر لاہور ہندوستان سے نکل کر پاکستان کے حدود میں رہ جائے گا۔ ورنہ وہ پہلے سے انتظام کرتے اور کچھ نہ ہوتا تو خواجہ حسن نظامی کے ہات پر بیعت کرتے یا اجمیر شریف جا کر نیم مسلمان ہو جاتے اب فساد کے شعلے بھڑک اٹھے تھے۔ آتش زدگی بمباری اور قتل و

غارت گری کا میدان گرم تھا اور پناہ کی کوئی صورت نہ تھی۔ جیکسن سے ان کی پرانی ملاقات تھی اور وہ اسی سے مشورہ کرنے کے لئے چلے آئے تھے۔

ویل مہاشے صاحب!

میرا خط آپ کو مل گیا تھا؟ نہال چند بولے۔

ہاں!

تو اب بتایئے۔ کیا کیا جائے ہندوؤں کی جانیں سخت خطرے میں ہیں۔ شاہ عالمی دروازہ تو جل چکا ہے۔ سربن کے محلے کے ہندو ختم ہو چکے ہیں۔ کرشن نگر، سنت نگر، آریہ نگر کے ہندو بھی اگر لاہور سے بحفاظت نہ نکالے گئے تو ایک ہفتے کے اندر ختم ہو جائیں گے۔ ڈی اے وی کالج میں راشن دو دن کے لئے باقی رہ گیا ہے۔ وہاں تین ہزار ہندو پناہ گزین ہیں۔

ہندوستان کی حکومت کیا کر رہی ہے؟ جیکسن نے پوچھا۔

انہوں نے ایک روز ہوائی جہاز سے روٹیاں ڈی۔ اے۔ وی کالج میں پھینکی تھیں۔ روٹیوں کے ساتھ میں یہ رقعہ بھی تھا کہ ہم لوگ آپ کے نکالنے کا جلد انتظام کر رہے ہیں۔ مگر صاحب ابھی تو حالات بہت برے ہیں۔ سنا ہے پندرہ سو ملٹری لاریوں کی ضرورت ہے اور ابھی صرف ڈھائی سو لاریوں کا بندوبست ہوا ہے۔ ہم لوگ تو انتظار کرتے کرتے مر جائیں گے۔

جیکسن نے مسکرا کر کہا۔ حکومت سو رہی ہے۔ کلکتہ کے ڈپو میں ہزاروں لاریاں پڑی ہیں۔ خود دلی میں، فیروز پور، لدھیانہ، کسی ایک شہر کی لاریوں کو Contact کر لیا جائے، پندرہ سو لاریوں کا بندوبست ہو سکتا ہے۔ وہ لوگ کچھ نہیں کریں گے۔

تو پھر ہم کہاں جائیں۔ یہاں بھی تو جنم ہے۔ پرماتما کے لئے جیکسن صاحب اس وقت ہماری مدد کیجئے، اگر ہم سب کی مدد آپ نہ کر سکتے ہوں تو میرے خاندان کو تو یہاں سے نکلوا دیجئے، میں ہوں، میری بیوی ہے۔ دو لڑکے ہیں، ایک داماد ہے، میری لڑکی ہے اور ہمارا ایشین کتا ہے، ہم لوگ ہوائی جہاز سے چلے جاویں گے یا ملٹری ٹرک سے۔ باقی لوگوں کو آپ ریل گاڑی سے یا پیدل جتھے یا کسی صورت سے بھیج

دیجئے۔ مگر ہمیں پہلے روانہ کر دیجئے۔

جیکسن نے یکا یک پوچھا۔ "آپ کتنے روپے خرچ کر سکتے ہیں؟"

دس پندرہ بیس پچاس ہزار۔ اس وقت روپیہ کا کیا سوال ہے۔

جیکسن نے سوچ سوچ کر کہا۔ بڑی مدت کے بعد۔ آپ فی الحال بیس ہزار روپیہ میرے پاس چھوڑ جایئے۔ میں مسلم خدمتگاروں کے سالار سے جو میرا واقف ہے بات کرتا ہوں۔ ممکن ہے کوئی صورت نکل آئے' مگر آپ سے ایک بات پوچھتا ہوں' آپ بھاگتے کیوں ہیں۔ جم کر مقابلہ کیوں نہیں کرتے حرامزادے مسلموں کا۔

کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ مقابلہ ہاتھوں سے ہو سکتا ہے صاحب وہاں تو مشین گنیں ہیں ان کے پاس اور رائفل اور چھرے۔

جیکسن نے اپنی کرسی نہال چند کے قریب کھسکا لی اور بولا۔ اگر آپ کو بھی یہ سب سامان مل جائے تو Have a pag اس نے مہاشے جی کو شراب پیش کرتے ہوئے کرسی اور قریب کر لی۔

مہاشے جی کا چہرہ روشن ہو گیا۔ سچ کہہ رہے ہیں آپ؟

جیکسن نے کہا ہم پرانے دوست ہیں۔ ہم آپ کی ضرور مدد کریں گے۔ اور سچ بات تو یہ ہے کہ لاہور پر دراصل ہندوؤں کا حق ہے۔ لاہور ہندوؤں نے بنایا ہے۔ اس کے باغات' اس کے مکانات' اس کے کالج' اس کے سینما گھر اس کی ساری رونق ہندوؤں کے دم سے ہے۔ وہی لاہور کے مالک ہیں' انہی کو اس میں رہنا چاہیے۔ مردوں کی طرح لڑیئے مہاشے جی۔ ہم آپ کی مدد کریں گے۔ آپ کے تصرف میں کتنے آدمی ہیں؟

مہاشے جی نے پیگ اٹھاتے ہوئے کہا۔ لاہور کے ہندو صرف ایک لیڈر پر اعتماد رکھتے ہیں۔ اور وہ ہے مہاشے نہال چند کھوکھری۔

زندہ باد! جیکسن نے کہا۔ پھر اس نے گھنٹی بجائی۔ اور بیرے کے کان میں کچھ کہا۔ تھوڑی دیر کے بعد بیرہ واپس آیا اور صاحب کے کان میں کچھ کہہ کر باہر چلا گیا۔

جیکسن نے کہا۔ "ابھی آپ یہاں بیٹھئے۔ ایک آدھے گھنٹے میں سب انتظام ہوا

جاتا ہے۔ میں نے ٹیلی فون کروایا ہے۔ ابھی اسلحہ جات کی بھری ہوئی ایک ملٹری لاری آپ کے ساتھ بھیجتا ہوں اور ایک آدمی بھی جو آپ کے آدمیوں کو تربیت بھی دے سکے گا۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟"

مہاشے جی دست بستہ کھڑے ہو گئے' ایشور آپ کو اس کا اجر دے گا۔ جیکسن صاحب!

جیکسن نے اٹھتے ہوئے کہا۔ مجھے ابھی ایک اور صاحب سے ملنا ہے۔ آپ یہاں بیٹھئے۔ ایک پیگ اور پیجئے۔ آج سردی بہت زیادہ ہے نا۔ اور وہاں اسلحہ جات کی قیمت وہ لاری ڈرائیور آپ سے وصول کر لے گا۔

شکریہ! مہاشے نہال چند چہکے' مگر ایک بات ہے۔ وہ آپ میرے خاندان کو امرتسر لے جانے کا بندوبست تو ضرور کر دیجئے' میں باقی یہاں سب بندوبست کر کے ہی جاؤں گا۔

بہت اچھا۔

ڈرائنگ روم میں مولانا اللہ داد پیرزادہ تشریف فرما تھے اور بے جھجک مے نوشی کر رہے تھے۔

کہئے مولانا مزے میں ہیں؟

چھوڑیئے نا جیکسن صاحب یہ باتیں۔ مزے تو پولیس والوں کے ہیں۔ آج کل سنا ہے لاہور کے ہر پولیس کے سپاہی نے اتنا سونا لوٹ لیا ہے کہ اب سات پشتوں کے لئے کافی ہو گا۔ اس کے لئے اب سنتریوں کا یہ حال ہے تو آپ کا بنگلہ تو سونے کی اینٹوں کا ہونا چاہیے۔

بڑے سور ہو مولانا۔ جیکسن نے ان کی پیٹھ تھپکتے ہوئے کہا۔

جبھی تو سی آئی ڈی میں کام کرتا ہوں۔ حضور۔

تو بولو کیا بات ہے۔

سنئے۔ ماڈل ٹاؤن میں سب سے زیادہ امیر ہندو اور سکھ لوگ رہتے ہیں۔ دو تین بار حملہ کرنے کی کوشش کی گئی۔ مگر وہاں ڈوگرہ سپاہیوں نے ایک نہ چلنے دی' پھر ان

لوگوں کے پاس پستول وغیرہ ہیں۔ ابھی چند روز ہوئے سرکلر روڈ کے مسلمانوں کا ایک جتھا حملہ کرنے کی نیت سے گیا تھا۔ چالیس آدمی مرے، ہمارے پاس ہتھیار کہاں ہیں۔ ہندوؤں کے پاس نجانے کہاں سے بم، مشین گنیں، رائفل، پستول، سب کچھ آ جاتے ہیں۔ بے چارے غریب مسلمانوں کو خالی خولی چھروں اور چاقوؤں سے لڑنا پڑ رہا ہے۔

تو میں اسلحہ جات کہاں سے دلواؤں۔ تم بھی کیسی باتیں کرتے ہو، اللہ داد، اسلحہ جات روپے کے بغیر نہیں مل سکتے۔ میرے پاس ہوتے تو میں نہ دے دیتا۔ مجھے تو ہندوستان میں نہیں پاکستان میں رہنا ہے ہندو بنیوں سے مجھے کوئی محبت نہیں ہے۔ اور پھر اسلام کی تعلیم ہمارے عیسائی مذہب سے ملتی جلتی ہے۔ عیسائی مسلمان کے ساتھ مل سکتا ہے۔ لیکن ہندو کے ساتھ اس کا نباہ نہیں ہو سکتا۔

میں روپیہ لایا ہوں۔ مولانا نے مسکرا کر کہا۔

کہاں ہے؟

ایک مسلمان جاگیردار کو پھانسا ہے۔ دین کے نام پر اور کفر کے خلاف جہاد کرنے کے لئے پچاس ہزار روپے لایا ہوں۔ آپ جلد از جلد اسلحہ جات کا انتظام کر دیجئے۔ ہم لوگ ماڈل ٹاؤن کو لوٹنا چاہتے ہیں۔

جیکسن نے گھنٹی بجائی۔ بیرا حاضر ہوا۔ اور جیکسن صاحب نے اس کے کان میں کچھ کہا اور واپس چلا گیا۔ چند منٹ بعد آیا تو اس نے پھر جیکسن صاحب کے کان میں کچھ کہا اور پھر واپس ہو گیا۔

جیکسن نے پچاس ہزار کے نوٹ لے کر کہا۔ مجھے ان کی ضرورت نہیں، تم ڈرائیور کو دے دینا۔ میں نے اسلحہ جات کی ایک لاری منگائی ہے۔ ابھی آدھے گھنٹے میں آ جائے گی۔ اسے لے کر چلے جاؤ اور دیکھو آئندہ مجھے پریشان نہ کرنا۔ ہاں سن لو۔ میں نے یہ اسلحہ جات بڑی مشکل سے منگائے ہیں اور جو دام وہ مانگتے تھے۔ اس سے کہیں کم قیمت پر میں نے کہا غریب مسلمان ہیں۔ اتنے پیسے کہاں دے سکیں گے۔ یہ تمہیں مفت میں پڑ رہے ہیں لے جاؤ انہیں اور میرا پیچھا چھوڑ دو۔ تم مسلمانوں کے

لئے میں نے اتنا کچھ کیا ہے اور تم سے اتنا بھی نہ ہو سکا کہ مجھے پولیس سپرنٹنڈنٹ ہی بنا دو۔ احسان فراموش کہیں کے۔

پیرزادہ نے دوسرا پیگ پیتے ہوئے کہا۔ بڑی اچھی شراب ہے۔ کہاں سے منگائی ہے۔

پرانی فرانسیسی شراب ہے۔ ایک ہندو راجہ نے بھیجی ہے۔ اس کی رانی کو لاہور سے بحفاظت دلی پہنچوا دیا تھا۔

رانی خوبصورت ہو گی۔ پیرزادہ نے ہونٹ چاٹتے ہوئے کہا۔ پرانی فرانسیسی شراب کی طرح۔

"ڈیم سوائن۔" جیکسن نے ہنستے ہوئے کہا۔ اور تم کیا کہو گے سنا ہے کہ آج کل ہر روز ایک نئی ہندو کنواری۔

اللہ دیتا ہے۔ پیرزادہ مسکرا کر پیگ اپنی آنکھوں کے سامنے لایا۔ بجلی کی روشنی میں شراب پگھلے ہوئے سونے کی طرح چمکنے لگی۔

جب دونوں لاریاں یکے بعد دیگرے بیس منٹ کا وقفہ رکھ کے دو مختلف سمتوں کو روانہ ہو گئیں۔ تو جیکسن اپنے بوٹ کھولے بغیر ڈرائنگ روم کے دیوان پر دراز ہو گیا اور چرٹ کے گھنے دھوئیں میں اپنے مستقبل کی منظر کشی کرنے لگا۔ اس کی بیوی ادھیڑ عمر کی ہو گئی تھی۔ وہ اسے ولایت نہیں لے جائے گا۔ بلکہ اسے یہاں طلاق دے کر اور ایک معقول رقم دے کر اس سے پیچھا چھڑا لے گا۔ کیونکہ اس کی بیوی کا رنگ اس کی بیٹیوں کی طرح صبیح نہ تھا بلکہ اس میں مہذیت کی جھلک نمایاں تھی۔ اس لئے جیکسن کبھی اپنی بیوی کو یوروپین لوگوں کی اونچی پارٹیوں میں نہ لے جاتا تھا۔ ہاں اپنی بیٹیوں سے اسے بڑی محبت تھی۔ وہ اپنی بیٹیوں کو ولایت لے جائے گا اور وہاں سو فیصدی خالص انگریزوں سے ان کی شادی کرے گا۔ اب اس کے پاس اتنا روپیہ ہو گیا تھا کہ وہ اس روپے سے اپنی لڑکیوں کے لئے اعلیٰ خاندان کے شریف لیکن غریب انگریز لڑکوں کو خرید سکتا تھا۔ وہ خود بھی ایک شادی کرے گا کسی حسین پری جمال انگریزی کوئیں سے جس کا اپنا حلقہ ہو گا۔ اور فیہال میں اس کے آباؤ اجداد کی تصاویر

لٹک رہی ہوں گی۔ اور اس کے ماتھے پر موتیوں کا تاج ہو گا۔ پرانا خاندانی نارمن تاج اور روزنامہ لنڈن ٹائمز میں ان کی شادی کی تصویر چھپے گی۔ جیکسن نے مسرت کا سانس لیا اور بیرے سے پوچھا۔

چھوٹی میم صاحب لوگ کدھر ہیں۔ برث سے آئے کہ نہیں۔

بیرے نے جواب دیا۔ بڑی میم صاحب سشمیا صاحب آ گئیں۔ چھوٹی میم صاحب روزی صاحب صبح آئیں گی۔ ناچنے کا مقابلہ ہے۔ یہ چٹھی چھوٹی میم صاحب روزی صاحب نے آپ کے واسطے دیا ہے۔

جیکسن نے دوسرا پیگ انڈیلا اور چٹھی کھول کر دیوان پر دراز ہو گیا اور اطمینان سے اپنی چہیتی بیٹی کا خط پڑھنے لگا۔

پیارے سے پیارے ڈارلنگ پپا۔

یہ تمہاری پیاری بیٹی روزی کا خط ہے۔ جو تمہیں برث سے لکھ رہی ہے۔ آج یہاں ناچ کا مقابلہ ہے نا۔ لیکن سشمیا جلد گھر لوٹ رہی ہے اور میں یہاں ٹھہر رہی ہوں۔ کیونکہ تمہیں معلوم ہے کہ میں اول نمبر پر آؤں گی۔ اس لئے انعام کو بھی کیوں چھوڑوں۔ لیکن اس وقت میں یہ خط تمہیں پیارے پپا اس مطلب کے لئے نہیں لکھ رہی۔ گو اس وقت میرے سامنے خوش پوش خوبصورت جوڑے راج ہنسوں کی طرح ناچ گھر کے فرش پر تیرتے ہوئے دائرے میں گزرتے جا رہے ہیں اور حسین فانوسوں کی روشنی ہے اور آرکسٹرا کی نغمہ باریاں ہیں اور ایک حسین طلائی غبار سا فضا میں چھا گیا ہے۔ جیسے سورج اور چاند یک جا ہو گئے ہوں اور ہمارے دلوں میں اتر آئے ہوں۔ میں نے تھوڑی سی شیری پی لی ہے اس لئے یہ شاعری کر رہی ہوں۔

مگر میں تمہیں یہ خط شیری یا شاعری یا رقص کے لئے نہیں لکھ رہی ہوں۔ یہ خط تمہیں اپنے ساتھی کے متعلق لکھ رہی ہوں جو اس وقت میرے سامنے کرسی پر بیٹھا ہے اور میری طرف دیکھ دیکھ کر مسکرا رہا ہے۔ اس کا نام آنند ہے۔ ہاں یہ ہندوستانی ہے اور میں اسے پچھلے دو برس سے جانتی ہوں۔ تم چونک پڑو گے پپا اور شاید خفا بھی ہو گئے۔ لیکن آنند ایسا لڑکا نہیں جس پر کوئی خفا ہو سکے۔ وہ اتنا اچھا ناچتا

ہے کہ برٹ میں کوئی اینگلو انڈین یا انگریز لڑکا بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ آنند کا رنگ سانولا ہے اور تمہیں معلوم ہے مجھے سانولے رنگ سے کتنی نفرت ہے۔ اسی لئے تو جب آنند مجھے پہلی بار برٹ میں ملا اور مجھ سے متعارف ہوا تو میں بڑی درشتی سے اس کے ساتھ پیش آئی لیکن دوسرے ہندستانی لڑکوں کی طرح وہ خفیف نہیں ہوا۔ اس نے برا بھی نہیں مانا۔ بلکہ صرف مسکرا دیا۔ تم جانتے ہو پپا کہ میں ہندوستانی لڑکوں سے میل جول پسند نہیں کرتی۔ لیکن آنند کی مسکراہٹ میں کوئی بات ضرور ہے' جب وہ مجھے دیکھ کر مسکرایا تو مجھے ایسا معلوم ہوا گویا میرے دل کے رنگین محلوں کی دنیا کی بنیادیں ڈولنے لگیں۔ آنند کی مسکراہٹ بڑی خطرناک ہے' اس کا قد چھ فٹ ہے۔ اس کی کمر چیتے کی طرح پتلی ہے۔ اس کی آنکھیں گہری سیاہ اور چمکتی ہوئی ہیں اور جب وہ کمر میں ہاتھ ڈال کر رقص کرتا ہے تو رقص گاہ پر جیسے اندھیرا سا چھا جاتا ہے۔ ذہن میں جیسے بنگال کے جنگل نمودار ہوتے ہیں اور ہزاروں پیڑ جھومنے لگتے ہیں۔ اور سبز سبز چکنے پتے نگاہوں میں جھولتے ہیں اور چیتوں' شیروں' بھیڑیوں اور جنگلی جانوروں کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ اور مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میرا گھر بنگال کے کسی جنگل میں ہے اور میں ایک شکاری کی بیوی ہوں اور درختوں کی چھال لپیٹ کر ایک بھیل کے ساتھ جنگل میں ناچ رہی ہوں۔ تم سچ مانتا پپا آنند کے ساتھ پہلے ناچ میں میں نے یہ سب کچھ محسوس کیا تھا۔ اور ایک سال تک وہ برابر مجھ سے ملنے' مجھ سے بات کرنے کا خواہاں رہا لیکن میں نے ایک اچھی اینگلو انڈین لڑکی کی طرح سے ہمیشہ ہمیشہ ٹھکرا دیا۔ آنند پڑھا لکھا ہے۔ بہت امیر ہے اس کا باپ گجرانوالے کا رئیس ہے آنند ولایت ہو آیا ہے اس کے پاس ایک پیکارڈ ہے۔ کئی انگریز محبوباؤں کی تصویریں ہیں جو اس سے شادی کرنا چاہتی ہیں لیکن میرے دل پر ان باتوں کا مطلق کوئی اثر نہ ہوا پورے ایک سال تک میں نے اس سے بات نہ کی اور وہ متواتر برٹ آتا رہا اور ذلیل قسم کی اینگلو انڈین اور کرسچن چھوکریوں کے ساتھ ناچتا رہا پہلے پہل تو وہ ناچتا بھی اچھا نہ تھا۔ پھر بیچ میں تین چار ماہ غائب رہا۔ پھر جب آیا تو اتنا اچھا ناچتا تھا کہ ایک روز مجھے بھی اس کے ساتھ ناچنا پڑا۔ اسی پہلے ناچ کے

تاثرات میں نے تمہیں ابھی بتائے ہیں۔ ناچ کے بعد ہم ایک میز پر بیٹھ گئے۔ مجھ پر جیسے کسی نے مسمریزم کر دیا تھا۔

آنند نے پوچھا تم مجھ سے ـــــ ہندستانیوں سے نفرت کرتی ہو۔

میں نے کہا۔ تمہارے جسموں سے بو آتی ہے۔

آنند نے کہا۔ مجھے سونگھ کے دیکھو۔ بو آتی ہے؟

میں نے سونگھ کر کہاں۔ ہاں مگر ـــــ یہ تو ایک عجب سی اچھی سی بو ہے۔ مجھے اقرار کرنا پڑا۔

آنند نے کہا۔ اب تم ثامیوں اور دوسری انگریز لڑکیوں کے جسم سونگھو۔ سو میں سے دس ہندی جسم بدبودار ہوں گے' اور سو میں پچاس انگریز جسم بدبودار ہوں گے۔ بدبودار اور بغیر غسل کئے یہ گندگی ایوڈی کولون سے کہیں چھپتی ہے اور تم لوگ کالے جو ہو؟ آنند ہنسا اور اس کے سانولے چہرے پر اس کے سفید دانت ایسے چمک اٹھے جیسے بجلی کوند گئی ہو' اور میں گھبرا سی گئی۔ وہ بولا۔ کیوں؟ میں نے کہا تمہارے دانت بہت اچھے ہیں۔

آنند بولا۔ ہندیوں کے دانت بڑے خوبصورت ہوتے ہیں۔ سانولے چہرے پر بڑے کھلتے ہیں جس کا ایک رنگ نہیں ہوتا۔ کئی رنگ ہوتے ہیں۔ کئی رنگوں کی ترکیب سے حسن تعمیر ہوتا ہے۔ میں نے کہا اور مجھے پپا نے بتایا ہے کہ تم لوگ بڑے دھوکے باز' جعلساز اور بددیانت ہوتے ہور اور تنظیم تم میں نام کو نہیں۔

آنند بولا۔ تمہارے والد پولیس آفیسر ہیں۔ وہ ہمیں ان ہندستانیوں سے پرکھتے ہیں جو روز و شب تھانے میں لائے جاتے ہیں۔ اگر میں سکاٹ لینڈ یارڈ کا افسر ہوتا تو میں بھی انگریزوں کے لئے شاید یہی الفاظ استعمال کرتا۔ رہا تنظیم کا سوال۔ تو کیا تم نہیں جانتی ہو کہ اب دو ایک سالوں میں تم لوگ یہاں سے جانے والے ہو' کانگرس اور لیگ کی تنظیم تم نے دیکھی ہے نا۔

مجھے کچھ معلوم نہیں۔ میں نے غصے سے جل کر کہا۔ پر تم ہندستانی ہوتے ہو سؤر کی اولاد اور میں یہ کہہ کر اس کے میز سے اٹھ گئی۔ آنند مسکراتا رہا۔ جب میں جا

رہی تھی تو اس نے کہا۔

سنو۔ میں پانچ ہزار برس پرانا ہوں۔ بہت داؤ جانتا ہوں ایک دن تمہیں قابو کر کے چھوڑوں گا۔

مجھے اس کا یہ چیلنج پسند نہ آیا۔ مگر شاید دل کے ایک ٹکڑے کو پسند بھی آیا۔ کیونکہ اس کے بعد غیر ارادی طور پر اس کے ساتھ مساویانہ سلوک کرنے لگی۔ بظاہر نہیں۔ دل کے اندر اسے اپنے برابر کا سمجھنے لگی۔ نجانے ایسا کیوں ہوا اور جب کبھی ہماری نگاہیں ایک دوسرے سے چار ہوئیں۔ تو نگاہیں پہلے مجھی کو ہٹانی پڑتیں اور اس کی مسکراہٹ تو پہلے کہہ چکی ہوں بہت ہی خطرناک ہے۔ دل کاٹنے سا لگتا ہے۔ جسم سن ہو جاتا ہے اور گلے میں پھندا سا پڑنے لگتا ہے۔ پھر تین چار ماہ گزر گئے اور میں اس کے ساتھ کبھی نہیں ناچی۔ اتنے عرصے کے بعد انعامی مقابلے کا دن آیا۔ چاروناچار مجھے مرد ساتھیوں میں اسی کا انتخاب کرنا پڑا۔ کیونکہ اس میں کوئی شک ہی نہیں کہ اس سے بہتر ناچنے والا ساتھی مجھے مقابلے کے لئے کہیں نہیں مل سکتا تھا۔ ہم دونوں نے انعام حاصل کیا۔ انعام حاصل کرنے کی خوشی میں ہم دونوں نے اکٹھے شراب پی ایک ہی جام سے۔ وہ میرا بوسہ بھی لے سکتا تھا۔ لیکن اس نے ہنس کر ٹال دیا اور مجھے بڑی راحت سی ہوئی کیونکہ وہ میری طرف دیکھ کر مسکراتا ہے۔ تو مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ مجھے چوم رہا ہے مجھ سے پیار کر رہا ہے۔ میرے گرد ہزاروں باہیں سی لپٹی جا رہی ہیں۔ سانولی سانولی طاقت ور باہیں اور میں اپنے آپ کو ان کی گرفت سے نہیں چھڑا سکتی اور میں خوفزدہ ہو کر اس کی میز سے اٹھ جاتی ہوں اور وہ نہیں سمجھتا کہ میں اس سے کیوں بھاگ رہی ہوں اور میں نہیں سمجھتی کہ میں اس کے نزدیک کیوں آ رہی ہوں۔ ہم دونوں کا وطن الگ ہے۔ قوم الگ ہے۔ مذہب الگ ہے۔ تہذیب الگ ہے۔ بول چال، کھانا پینا، اٹھنا بیٹھنا، ہر چیز الگ ہے۔ پھر اس قدر شدید قرب کا اذیت ناک احساس مجھے کیوں ہوتا ہے۔ اکثر راتیں میری یہی سوچتے سوچتے آنکھوں میں کٹ گئی ہیں۔ میں سب کچھ تمہیں پیارے پپا نہایت تفصیل سے لکھ رہی ہوں۔ تاکہ تم اپنی پیاری روزی کے فیصلے اور اس کے مستقبل کی تصویر سے

آگہی۔ گہری آگاہی حاصل کر سکو۔

اب میں نے اس سے چھپ چھپ کے ملنا شروع کر دیا کیونکہ برٹ میں لوگ اسے روزی کا انڈین پارٹنر کہنے لگے تھے اور سنتھیا اس امر کو سخت ناپسند کرتی تھی اور اگر میں آنند کے ساتھ ملاطفت سے پیش آتی تو پپا تمہاری بدنامی بھی ہوتی اور لوگ کہتے کہ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس مسٹر جیکسن کی لڑکی ایک کالے ہندستانی سے عشق لڑا رہی ہے۔ یہ میں کیسے برداشت کر لیتی' اس لئے میں اس سے چھپ چھپ کے ملتی۔ ہم لوگ اکثر میٹرو میں ناچنے کے لئے جایا کرتے۔ وہاں سب ہندستانی لوگ ہوتے ہیں اور آرکسٹرا تو بہت ہی اچھا ہے۔ یہاں مجھے پہلی بار بہت سے ہندستانی لڑکوں سے ملنے کا اتفاق ہوا' آرٹسٹ' ادیب' سیاست داں' سوشلسٹ' کیونسٹ' اکالی' کھدر پوش' یہ لوگ جو ہندی فلموں کی باتیں کرتے تھے' ہندی کتابوں کی' ہندی مزدوروں' کانوں کی' ملک و قوم کو آگے لے جانے کی باتیں سنجیدہ باتیں' خوفناک باتیں' انگریزی راج کو الٹ دینے کی باتیں' ساری دنیا میں ایک برادرانہ نظام ایک نئی انسانیت کو جنم دینے کی باتیں' ایسی باتیں جو میں نے برٹ انسٹی ٹیوٹ میں کبھی نہ سنی تھیں۔ ایسی باتیں جو میں نے اسکول یا گھر میں کہیں بھی نہ سنی تھیں۔ ایسی باتیں جن سے مل کر اس دنیا کا سکھ دکھ' رنج اور خوشی بنتی ہے۔ ایسی باتیں جنہیں سن کر کچھ کام کرنے کو جی چاہتا ہے۔ پپا اب مجھے معلوم ہوا کہ تم اور تمہاری دنیا کتنی فرسودہ ہے۔ مجھے اس دنیا سے پیار ہے تم سے' مما سے' سنتھیا سے' مگر تم اب مصری ممیوں کی طرح پرانے ہو چکے ہوں' پیارے مگر پرانے' ان رومن بتوں کی طرح جو عجائب گھروں میں رکھے ہوئے ہیں۔

ان دو سالوں کے عرصے میں میں نے کیا کیا ہے۔ میں یہ سب کچھ بتا دینا چاہتی ہوں۔ کیونکہ یہ سب کچھ میں نے تم سے اور سنتھیا سے اور مما سے چھپ کے' ساری دنیا کی نظروں سے چھپا کر کیا ہے۔ میں نے ان دو سالوں میں ہندستان سے محبت کرنا سیکھا ہے۔ میں نے اس کی بولی سیکھی ہے۔ میں نے اس کے کپڑے پہنے ہیں۔ میں نے اس کے کھانے کھائے ہیں۔ میں نے اس کے گیتوں کو گایا ہے۔ اس کے ناچ

گانوں میں حصہ لیا ہے۔ میرے بدن پر ساڑھی اس قدر اچھی لگتی ہے کہ کیا کہوں، جی چاہتا ہے دن بھر اسے اپنے جسم سے لپٹائے رکھوں۔ مجھے کتھا کلی اور بھارت ناٹیم کے رقص کی ابدی غنائیت سے عشق ہو گیا ہے۔ دو سول سال سے میرے ضمیر پر جو زنگ چڑھ چکا ہے اب وہ اتر گیا ہے۔ پپا میں ہندستانی لڑکی ہوں۔ میری رگوں میں ہندستان کا خون ہے۔ تم بھی ہندستانی ہو پپا۔ غور سے دیکھو تو معلوم ہو گا کہ ہمارے چہرے بالکل انگریزوں سے نہیں ہیں۔ ان میں پانچ ہزار سال پرانے نقوش ابھرتے نظر آتے ہیں۔ تم میں، ستمیا میں، مما میں ہم سب لوگ ہندستانی ہیں۔ غور سے دیکھو۔ میں نے ان دو سالوں میں ہندستان کو غور سے دیکھا ہے۔ یہ لوگ اتنے ہی برے بھلے ہیں جتنے ہم لوگ، پپا مجھے اب جلیبیاں اور امرتیاں اور موتی چور کے لڈو بہت پسند ہیں اور کھویا اور دال موٹ اور شلوار قمیض بھی مجھے بہت اچھی لگتی ہے اور مغلئی کھانے تو اتنے اچھے ہوتے ہیں کہ ہم لوگوں کے کھانے تو بالکل جنگلی سے معلوم ہوتے ہیں، قورمہ اور روغن جوش اور شامی کباب اور مرغ مسلم اور زردہ پلاؤ، پپا سچ کہتی ہوں تم نے تو پھیکے بدمزہ کھانے اور سوپ پلا پلا کر مار ڈالا۔ اب بھی گھر میں چپتی ہوں، مگر آئندہ سے کبھی نہیں پیوں گی اور تم نے میگھ دوت کا ترجمہ نہیں پڑھا ہے ورنہ ہندیوں کو کبھی وحشی نہ کہتے، اس روز بادل گھر کے آئے تھے اور ہمارے سروں پر لوکاٹ کے پیلے پیلے گچھے لٹک رہے تھے اور ایسی جان بخش کنک دھوپ تھی، جب آنند نے ہمیں میگھ دوت کے شعر سنائے۔ شیکسپیئر کی عظمت اور گوئٹے کا فلسفہ اور شیلی کا عشق۔ یہ سب کچھ میگھ دوت میں ہے۔ جو قوم ایسی شاعری کر سکتی ہے۔ اسے غیر متمدن کہنا اپنی حماقت کا ثبوت دینا ہے۔ پپا تم نے سولہ سال تک مجھ سے دھوکا کیا۔ تم نے زندگی بھر اپنے آپ کو دھوکے میں رکھا۔ تم نے اپنے خون سے اپنے ہندی پن کو الگ کرنا چاہا۔ تم نے اپنی قوم پر حکومت کی۔ جب کہ تمہیں اس کی خدمت کرنی چاہیے تھی، تم نے ہندو اور مسلمانوں کو لڑوایا اور آج بھی اسلحہ جات دے کر انہیں لڑوا رہے ہو۔ جب کہ تمہیں ان کے زخموں پر مرہم رکھنا چاہیے تھا۔ آج میری آنکھیں کھلی ہیں اور میں نے اس زندگی کو چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا ہے۔

میں آنند کے ساتھ جا رہی ہوں۔ آنند کے پاس اب کچھ نہیں ہے۔ اس کا گھر لٹ چکا ہے۔ اس کی پیکارڈ جلا ڈالی گئی ہے اس کے ماں باپ قتل کئے جا چکے ہیں۔ اس کے پاس ایک قمیض ہے اور ایک پتلون۔ لیکن اس کا دل اپنا ہے۔ اس کی روح اپنی ہے۔ اس کی تہذیب اس کے پاس ہے اور وہ جذبہ انتقام سے مغلوب نہیں، ہم دونوں نے ایک نئی انسانیت کا پیغام سنا ہے۔ اس جنت ارضی کا تصور کیا ہے۔ جہاں ہندو اور مسلمان۔ انگریز اور یہودی۔ روسی اور امریکی مسرت کے ایک ہی ڈیرے میں آ جاتے ہیں۔ پپا تمہاری کھلنڈی لڑکی ایک کاٹن کی ساری پہن کر مہاجرین کے کیمپ میں جا رہی ہے۔ ہم لوگ ہندوؤں کے پاس جائیں گے، مسلمانوں کے پاس جائیں گے اور شاید کوئی ہماری بات نہیں سنے گا اور شاید اسی طرح ہماری موت بھی ہو جائے گی اور شاید یہ بڑی حماقت ہو گی۔ بڑی بھاری غلطی ہو گی، اینگلو انڈین سماج سے غداری ہو گی۔ مگر کوئی مجھ سے نہ جانے کون بار بار یہی کہتا ہے تو کر تو یہی کر۔ تو اسی طرح اپنے باپ کے گناہوں کا کفارہ ادا کرے گی تو اسی طرح دو سو سال کی ندامت کے داغ دھوئے گی تو اسی طرح اپنی روح کا سچا حسن حاصل کرے گی۔ تو ہندستانی عورت ہے۔ تیرا مقام خدمت ہے۔ ناچ گھر نہیں۔

روزی

جیکسن لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے اٹھا۔ اس کا نشہ غائب ہو چکا تھا اس نے جلدی سے دو پیگ انڈیلے اور یکے با دیگرے جلدی جلدی پی گیا۔ وہ چلتا چلتا قد آدم شیشے کے سامنے پہنچ گیا۔ وہ اپنی طرف حیرت سے دیکھنے لگا۔ میں جیکسن ہوں۔ روزی میری بیٹی ہے۔ یہ روزی کا خط ہے اس کی آنکھوں کے نیچے گڑھے پڑ گئے۔ یکایک اسے معلوم ہوا کہ اس کے چہرے پر ہندی خط و خال نمایاں ہو رہے ہیں۔ یہ ناک انگریز کی نہیں ہے۔ یہ ہونٹ انگریز کے نہیں ہیں۔ یہ ماتھا۔ یہ کان۔ یہ آنکھیں۔ یہ ٹھوڑی۔ یہ تو انگریز کے نہیں ہیں۔ میں ہندستانی ہوں۔ میں ہندستانی ہوں۔ نہیں نہیں میں انگریز ہوں۔ میں انگریز ہوں۔ میرا گھر یارک شائر میں ہے۔ میری بیوی ایک انگریز کو نیٹیس ہے۔ اس کے سر پر رومن تاج ہے اور وہ فریئر ہال میں میرا انتظار کر

رہی ہے۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو پکڑ لیا۔ کیوں کہ اب پھر وہی ہندستانی خدوخال ابھر رہے تھے' وہی ہندستانی ماتھا' وہی کالے بال' وہی ٹھوڑی' وہی ہونٹ' وہی کان' وہی لب' وہی ہندی آنکھیں' بھوؤں کی تراش تک تو ہندستانی ہے۔

جیکسن چیخا۔ نہیں نہیں میں ہندستانی نہیں ہوں۔ میں انگریز ہوں۔ میں ہندستانی نہیں ہوں۔ میں انگریز ہوں۔ خالص انگریز۔ یارک شائر۔ ڈربی۔ کوئینس۔ نارمن۔ تھوبرین۔ نائٹ شاہ آرتھر.........

شیشے کے چاروں طرف ہندستانی قہقہے لگا رہے تھے۔ ہندستانی ہی ہندستانی۔ چاروں طرف ہندستانی چہرے قہقہے لگاتے ہوئے قریب آتے ہوئے۔ اور قریب آتے ہوئے......

جیکسن نے پستول اٹھا کر فائر کر دیا۔

دوسرے لمحے وہ فرش پر گر گیا۔ اس کی کنپٹی سے خون بہہ رہا تھا۔

دوسری موت

شواجی پارک بمبئی کی خصوصیتوں میں سے ایک ہے، وہاں کی دیکھنے لائق جگہوں میں ہے۔ گو شروع میں یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ یہاں کون سی چیز دیکھنے لائق ہے! عمارتیں؟ عمارتیں تو بمبئی میں چاروں طرف ہیں۔ نفیس فلیٹ؟ وہ تو میرین ڈرائیو پر جاکر دیکھئے جہاں ایک فلیٹ کے لئے پچیس ہزار کی پگڑی دینی پڑتی ہے۔ ناریل کے درخت؟ وہ بھی جوہو پر ہزاروں کی تعداد میں نظر آئیں گے؟ شواجی پارک میں تو ٹیلے ہی ٹیلے نظر آتے ہیں۔ سمندر؟ بھئی، سمندر تو بمبئی کے چاروں طرف ہے، اس میں شواجی پارک کی کیا خصوصیت ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا اسے اتنی اہمیت کیوں دی گئی ہے۔

دراصل بات اتنی جلدی سمجھ میں آنے والی نہیں ہے۔ اس کے لئے شواجی پارک میں رہنا ضروری ہے۔ اور کوئی دو چار مہینے رہنے سے کام نہیں چلے گا، برسوں تک مستقل طور پر رہنا چاہیئے۔ تب جاکر کہیں اسے دیکھنے جاننے لائق خصوصیت کا پتہ چل سکے گا۔

مثال کے طور پر میرے یہاں آکر بسنے کے پہلے چھ مہینوں میں مجھے یہ بھی پتہ نہیں چل سکا کہ میرے فلیٹ کے بالکل اوپر، دوسرے فلیٹ میں، شراب کی بھٹی ہے مسٹر رمولو جو اوپر کے فلیٹ میں رہتے تھے، ماہر بٹن ساز تھے اور سندھی کارخانے کی بٹن فیکٹری میں کام کرتے تھے۔ جب وہ پکڑے گئے تو اچانک ہی ہمیں پتہ چلا کہ وہ صرف بٹن سازی میں ہی استاد نہیں تھے۔ شراب تیار کرنے میں بھی کمال کرتے تھے۔ ان کی بھٹی میں کھنچی شراب ذائقہ، رنگت اور نشے میں مشہور فرانسیسی شرابوں کو بھی مات کرتی تھی۔ لیکن یہ سب کچھ ہمیں بعد میں معلوم ہوا۔ پہلے چھ مہینے تو ہم انہیں بٹن سازی کا ہی ماہر سمجھتے رہے۔

مسٹر رمولو بڑے خوش مزاج اور ملن سار آدمی تھے۔ اکثر اترتے چڑھتے بلڈنگ کی سیڑھیوں پر ان سے ملاقات ہو جاتی تھی اور کئی کئی منٹ تک ان سے حیدر آباد کے میناکاری کے اور کانپور کے چمڑے کے بٹنوں پر بات ہوتی رہتی تھی۔ پھر ان کا نام کتنا اچھا تھا۔ رمولو... رمولو... زبان پر کس خوبی کے ساتھ گھومتا ہے، رمولو، رمولو۔ کتنی گھلاوٹ ہے اس نام میں، لکھنو کی ملائی کا سا مزا آتا ہے!

اسی شواجی پارک میں میرے ایک اور دوست رہتے ہیں۔ نام ہے خواجہ مشہد نواز۔ نام سن کر ایسا معلوم ہوتا ہے مانو کوئی گھوڑا کچے شلغم چبا رہا ہے۔ بھلا آپ ہی بتایئے، ایسے نام کا آدمی اس دنیا میں کیا ترقی کر سکتا ہے۔ خیر، ذکر مسٹر رمولو کا ہو رہا تھا۔ جب وہ ناجائز شراب کھینچنے کے جرم میں پکڑا گیا تو مجھے بڑا تعجب ہوا۔ میرے ایک اور دوست ہیں جو اسی بلڈنگ میں رہتے تھے۔ اس سال وہ فرانس میں رہ آئے تھے۔ بہت ہی خوش طبیعت آدمی تھے موٹر گاڑی بھی رکھتے تھے۔ کبھی کبھار جب میرے رشتے دار گاؤں سے بمبئی سیر کے لئے آتے تو ان سے گاڑی مانگ لیتا۔ وہ امپورٹ ۔ ایکس پورٹ کے تاجر تھے۔ فیروز شاہ مہتہ روڈ پر ان کا دفتر تھا۔ مسٹر رمولو کی گرفتاری پر وہ ہنس کر فرماتے، "بھئی کچھ بھی ہو، رمولو برانڈ کی شراب کا جواب بمبئی میں نہیں ہے۔ اسے چکھ کر پیرس کی گلیاں یاد آ جاتی ہیں، اور فرانسیسی کنواری کا جسم جو، اب پیرس میں نایاب ہوتا جا رہا ہے، آنکھوں کے آگے گھومنے لگتا ہے۔"

'مگر،' میں نے اپنے دوست سے کہا، 'میں تو سمجھتا تھا کہ وہ بٹن...'

انہوں نے بات کاٹتے ہوئے کہا، 'تم نرے چغد ہو۔ ارے میاں، یہ شواجی پارک ہے۔ یہاں ہر آدمی دو کام ضرور کرتا ہے۔ ایک سفید مارکیٹ کا، ایک بلیک مارکیٹ کا۔ سفید مارکیٹ میں پیسا نہیں ہے۔ پیسہ تو صرف بلیک مارکیٹ سے ملتا ہے۔ رمولو کی شراب مالا بار ہل پر جاتی تھی بڑے بڑے امیر گھرانوں میں۔ بمبئی کے پولیس کمشنر نے اکثر دعوتوں میں اس شراب کو چکھا ہے۔ کیا بات کرتے ہو۔'

جب پولیس مسٹر رمولو کو لے گئی تو مجھے بڑا دکھ ہوا۔ میرے دوست کہنے لگے، 'اماں، کیوں افسوس کرتے ہو۔ وہ بڑا فطرتی اور کائیاں ہے دور تک اس کی پہنچ ہے۔

دیکھنا، بہت جلد چھوٹ جائے گا۔'

ایسا ہی ہوا بھی کچھ دن بعد ہم نے مسٹر رمولو کو ہنستے کھیلتے واپس آتے دیکھا۔ مگر اب وہ شواجی پارک کا فلیٹ چھوڑ رہے تھے۔ دس ہزار کی پگڑی پر انہوں نے اپنا فلیٹ ایک سندھی پناہ گزین کو دے دیا تھا جو بے چارا اپنی جان بچا کر بمبئی بھاگ آیا تھا اسے اپنے ڈالمیشین کتے کا بہت افسوس تھا جو کراچی میں ہی چھوٹ گیا تھا۔ بیوی۔ بچے، زیور ۔دولت، سب کچھ وہ لے آیا تھا' مگر اس کے مکان، اس کا کارخانہ، اس کا باغ وہیں رہ گیا تھا۔ پر ان چیزوں کا اسے اتنا افسوس نہیں تھا جتنا ڈالمیشن کتے کا جو غلطی سے کراچی میں رہ گیا تھا۔ اس نے اپنے مسلمان دوستوں کو کئی تار دیئے، لیکن وہ لوگ اتنے کٹر پاکستانی تھے کہ انہوں نے بے چارے کا کتا وہیں رکھ لیا۔ بڑا خوبصورت کتا تھا وہ۔ سفید براق، جلد پر چتلے۔ چتلے داغ، جیسے نئے فیشن کی ساڑیاں ہوتی ہیں، نا، بس اس کا پیارا ڈالمیشین بھی اسی ڈیزائن کا تھا۔ ظالم پاکستانیوں نے ہتھیا لیا اور ہماری سرکار ہے کہ ایسے پناہ گزینوں کے لئے کچھ نہیں کرتی۔

یہ بات کہ شواجی پارک میں ہر آدمی دو کام کرتا ہے، مجھے جنچی نہیں، اور جنچی بھی تو اس وقت جب میرے دوست خود لڑکیوں کی خرید و فروخت کے سلسلے میں پکڑے گئے۔ بعد میں ان کا یہ راز کھلا کہ ان کا امپورٹ۔ ایکسپورٹ کا دفتر بھی جو فیروز شاہ مہتہ روڈ پر تھا، دراصل لڑکیوں کی امپورٹ ایکسپورٹ کا کام کرتا تھا۔ یہ کام غریب پناہ گزینوں کی آمد سے اور بھی بڑھ گیا تھا۔

انہیں دنوں میرے دوست نے ایک نئی ڈیملر خریدی تھی اور اس میں اکثر خوبصورت لڑکیوں کو ڈرائیو کے لئے لے جایا کرتے تھے۔ مگر وہ لڑکیاں تو اتنی فیشن پرست تھیں کہ مجھے کبھی انداز ہی نہیں ہوا کہ ان کی بھی امپورٹ ایکسپورٹ ہوتی ہے۔ اس قدر ہائی کوالٹی مال ہوتا تھا کہ پولس کی نگاہ بھی چوک جاتی تھی، اور پھر بڑے بڑے دوست تھے میرے دوست کے۔

ان کے فلیٹ میں میری ملاقات نواب آکھر گھسیارا کے ساتھ ہوئی، مسٹر جی

حضوری کے ساتھ ہوئی، مولانا شرف اللہ سے ہوئی، سیٹھ دلپت چوواڑیا سے ہوئی۔ کون لوگ تھے وہ؟ ہر ایک کے پاس پندرہ بیس بلڈنگیں، آٹھ دس گاڑیاں، پانچ سات معشوقائیں اور دو چار سیاسی لیڈر تھے!اور جب میں اپنے دوست سے کہتا، 'بھائی تم بڑے بارسوخ ہو۔ ایکادھ بزنیس ہمیں بھی کرادو!' تو وہ اپنے موٹے سگار کی راکھ جھاڑتے ہوئے کہتے، 'ارے بھئی تم کیا جانو، اس بزنیس میں کتنی پریشانی ہے۔'

اب پتہ چلا جب پولیس انہیں گرفتار کر کے لے گئی کہ اس میں کتنی پریشانی ہے۔ سنا ہے کہ جو لڑکی ایکسپورٹ کی گئی، وہ صرف تیرہ سال کی تھی۔ اس کے ماں باپ نے اسے پندرہ سو میں بیچ دیا تھا۔ میرے دوست نے ایک ریاست میں اسے سات ہزار میں ایکسپورٹ کر دیا۔ کسی نے بیچ میں کمیشن زیادہ مانگا اور میرے دوست نے نہیں دیا۔ اس نے پولیس میں جاکر اطلاع کر دی اور آپ جانئے، پولیس تو ایسے معاملوں کی تاک میں رہتی ہے۔ بے چارے شریف آدمی کو گرفتار کر لیا۔

ایسے واقعات شواجی پارک میں ہوتے رہتے ہیں۔ میرا ایک دوست تھا بھنڈاری۔ بیچارہ کراچی سے بزنیس کے لئے آیا تھا۔ یہاں ایک گجراتی لڑکی سے عشق کر بیٹھا اور بزنیس کے بجائے اس نے لڑکی کی مانوسیت سے تنگ آکر زہر کھالیا۔ آپ اس لڑکی کو دیکھیں تو زہر تو زہر مٹھائی بھی نہیں کھائی جا سکتی۔ مگر دل ہی تو ہے۔

شواجی پارک میں کارخانے دار رہتے ہیں اور کرخندار بھی، سیٹھ لوگ بھی اور سیٹھوں کے غلام بھی کہیں۔ کہیں فلم ایکٹر بھی نظر آجاتے ہیں۔

'وہ گھر دیکھا ہے تم نے،' جہاں پر شری گھوش رہتے ہیں؟'

'شری گھوش! سچ مچ ؟'

'ہاں۔'

'وہی شری گھوش جنہوں نے چڑی کا اکّا، چور کا مور اور گوبھی کے پھول میں کام کیا ہے۔'

'ہاں۔'

'کمال ہے بھائی۔ یہ چھوٹا سا مکان ان کا ہے؟'

اور وہ جو مکان ہے جس کے باہر بھنگن جھاڑو دے رہی ہے، وہاں مس دمساز لانتی رہتی ہیں۔'

'دمساز لان تی؟'

'لا۔ن۔تی نہیں، لانتی!'

'دمساز لانتی! جھوٹ تو نہیں بولتے۔ وہیں دمساز لانتی جو بدقسمت؟ من کی پھوہار اور میں کیسے پکوں کی ہیروئن ہے۔"

'وہی! وہی!'

'بھئی یقین نہیں آتا، اتنی بڑی ہیروئن یہاں رہتی ہے!'

'یقین نہیں آتا تو اس بھنگن سے پوچھ لو۔'

'کمال کر دیا بھئی۔'

'کیا سمجھتے ہو، یہ شواجی پارک ہے۔' میرا گائڈ جواب دیتا ہے۔

اب مجھے یہاں رہتے ہوئے چھ سال ہو گئے ہیں۔ اب میں کہہ سکتا ہوں کہ شواجی پارک واقعئی دیکھنے لائق جگہ ہے۔ یہاں فلمی دنیا کے بڑے بڑے ہیرو اور ہیروئن موجود ہیں، بڑے بڑے سیٹھ اور کارخانے دار، اخباروں کے مالک اور بڑے بڑے جرنلسٹ جن کی قلم کا لوہا دنیا مانتی ہے۔ اور پھر معمولی لوگ بھی رہتے ہیں، دھوبی، نائی، کلرک، افسانہ نگار، مٹھائی بیچنے والے، کنجڑے، ڈرائیور، ویٹر، پان والے، پھول والے، ناریل والے، دہی۔بڑے کی چاٹ والے، معمولی لوگ جن میں طوائفیں بھی شامل ہیں!

شواجی پارک انسانوں کی دوسری بستیوں کی طرح کی ایک اور آبادی ہے۔ اس آبادی میں ہندو زیادہ ہیں، مسلمان کم ہیں، یوں سمجھئے کہ سو میں سے پچانوے تو ہندو ہونگے اور پانچ مسلمان۔ ہندوؤں میں ستر مرہٹے ہونگے اور بیس گجراتی، باقی پانچ فلم ایکٹر سمجھئے۔ مرہٹے عام طور سے مڈل یا نچلے طبقے کی اولاد ہیں، گجراتی امیروں کے طبقے میں اپنا مقام رکھتے ہیں اور جو فلم ایکٹر ہیں وہ ان دونوں طبقوں کے بیچ میں گزرتے رہتے ہیں، کبھی یہاں، کبھی وہاں۔ جنگ کے زمانے میں یہ لوگ لاکھوں کماتے تھے۔ جنگ

کے بعد لاکھوں گنوا دیئے انہوں نے اور آج کل، بیکاری کے زمانے میں، ہندو سیوک سنگھ میں نام لکھوالیا ہے اور ہندو مذہب سے 'محبت' کرنے لگے ہیں۔ جنگ کے زمانے میں یہ طوائفوں سے 'محبت' کرتے تھے۔ کبھی کبھی غور کرتا ہوں تو اپنی ساری زندگی ۔ذاتی، اور خاص قومی امپورٹ ایکسپورٹ کے اصول پر چلتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔

شواجی پارک میں سبھی طرح کے لوگ ہیں۔ مگر پھر بھی چھ سال سے دیکھ رہا ہوں لوگ اپنے فلیٹوں میں آرام سے رہتے ہوں یا دکھ سے رہتے ہوں، شرافت سے ضرور رہتے ہیں۔ کیونکہ انسان کی برادری کے ہزاروں لوگ غنڈا گردی کے اصول پر کسی بستی کو زیادہ دیر تک نہیں چلا سکتے۔ اس لئے بچّے آسانی سے گلیوں میں گھومتے ہیں، عورتیں آزادی سے پارک میں سیر کرتی ہیں، دوکانوں پر سودہ سلف خریدتی ہیں، مرد دفتروں، کارخانوں اور دوکانوں میں کام کرتے ہیں اور شام کو، ایک دھوتی اور کمیز پہنے ہوئے، سمندر کے کنارے آتے اور گپ شپ اڑاتے ہیں۔ ننھے ننھے کھلونوں کی ننھی ننھی حرکتیں، اور قریب ہی سمندر کی گھن گرج گونج چاروں پہر سنائی دیتی ہے اور انسان کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں کے لئے بیک گراؤنڈ میوزک کا کام دیتی ہے۔ کبھی موسیقی ہے تو کبھی گرج ہے، کبھی خطرہ ہے تو کبھی خوشی ہے، سمندر کی گونج ہر آن، انسان کے سکھ اور دکھوں کے ساتھ بدلتی رہتی ہے اور شواجی پارک کی آبادی اس گونج میں اپنے ڈھنگ کے سُر ڈھونڈتی رہتی ہے۔

شواجی پارک میں میرے بسنے کے چھٹویں سال ایک طوفان اٹھا۔ یہ طوفان بہت دور سے آیا تھا۔ گو سمندر شواجی پارک کے بہت قریب ہے، لیکن یہ طوفان اس سمندر سے نہیں آیا تھا، یہ بہت دور سے، آج سے ایک سو سال دور پیچھے سے، آیا تھا۔

یہ طوفان گدر سے شروع ہوا اور پندرہ اگست کو سارے ہندوستان میں پھیل گیا۔ انسانی تاریخ کے اس طوفان نے ہر ہندوستانی کے گھر کی چولیں ہلا دیں اور کہیں نہ کہیں اس کی روح میں، اس کے بدن میں، اس کے، ذہن میں، اس کے بول چال میں، اس کی زندگی میں کوئی نہ کوئی انقلاب ضرور پیدا کر دیا۔

یہ بڑا زبردست طوفان تھا جو صدیوں کے بعد ہی انسانوں کی زندگی میں آتا ہے۔ تو اسے شروع ہوئے سو سال سے زیادہ وقت نہیں ہوا تھا کئی لوگ کہتے ہیں کہ یہ طوفان نہیں تھا، دو طوفانوں کی ٹکر تھی، ایک طوفان ایک سو سال پیچھے شروع ہوا تھا اور دوسرا طوفان جو اس کے کہیں پہلے منوسمرتی کی بدرجہ وار نسلی تقسیم سے شروع ہوا۔ سینکڑوں سال پہلے وہ نظام جو بدھ کے عروج کا سبب بنا، جس نے اسلام کو پھلنے پھولنے کا موقع دیا، جس نے اچھوت پیدا کئے، آج پاکستان کی پیدائش کا سبب بن رہا تھا۔ بلاشبہ یہ دو طوفانوں کی ٹکر تھی۔ قومیت کا جذبہ اور نسلی نظام کا کارنامہ۔ وطن پرستی کا سیلاب آزادی لایا اور نسلی نظام کے کارنامے نے پاکستان کو شکل دی اور اب دونوں طوفان ٹکرا رہے تھے۔ بجلی کی کڑک، آندھی طوفان، گونج گرج، انسانی چیخیں، خون کی لہریں، بجلی جو گھروں کو جلا گئی، کھیتوں کو جلا گئی، انسانوں کو جلا گئی۔ یہ طوفان ادھر سے آیا جدھر سے آریہ لوگ آج سے ہزار سال پہلے ہند میں داخل ہوئے تھے۔

سردار دوہتڑ سنگھ اسی طوفان کے ریلے میں بہتا شواجی پارک آنکلا تھا۔ دوہتڑ سنگھ لائل پور کا ہٹھ چھٹ کسان تھا، جسم و جان کا مضبوط۔ اس کے باپ داداؤں نے لائل پور کی بنجر زمین میں اپنی محنت سے بہار کے پھول اگائے تھے۔ وہ لائل پور کا بوٹا تھا، جس طرح وہاں کا گیہوں، وہاں کی روئی، وہاں کے پیلوں لائل پور کے تھے۔ جب ایک بوٹا اپنے قدرتی ماحول آب و ہوا، اپنی خاص جگہ اپنی زمین سے اکھاڑ لیا جائے تو دوسری جگہ اس کی کاشت مشکل سے ہوتی ہے، اس معمولی بات کو ہر کسان اچھی طرح سمجھتا ہے۔ ہمارے ملک کو بانٹنے والے بھول گئے کہ دوہتڑ سنگھ کے قدم شواجی پارک میں نہیں جم سکتے تھے۔ اس کی جڑیں شواجی پارک کی فزا کو قبول نہیں کرتی تھیں۔ اس کی رگیں مرجھانے لگیں تھی۔ وہ تندرست پودا نہ تھا، بیمار پودا تھا۔

دوہتڑ سنگھ کی زمین اس کے پاس نہ تھی۔ بیوی لائل پور کے ایک جانگلی سردار نے بھگالی تھی، اس کی آنکھوں کے سامنے اور وہ کچھ نہیں کر سکا تھا۔ اس کے ماں باپ اس کے سامنے موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے تھے۔ پھر فوج کی مدد پہنچ گئی اور وہ بچ گیا۔

لیکن کرپان اس کے پہلو میں ہر وقت بیچین رہتی تھی۔ محنتی کسان ماہیا اور ہیر گانے والا کسان ہنسی ٹھٹھولی میں ڈوبا رہنے والا کسان خون کا پیاسا بن گیا۔ اس نے آتے ہی جب دیکھا کہ شواجی پارک میں مسلمان بڑے مزے سے رہتے ہیں تو وہ بھوچکا سا رہ گیا۔ وہ گلی میں سے گزر رہا تھا کہ اس کی نظر ایک پٹھان پر پڑی جو کس دمساز لانتی کے مکان کے باہر کھڑا تھا۔ اسے بلوچی سپاہی یاد آئے جنہوں نے اس کے گاؤں پر حملہ کیا تھا۔ بالکل اچانک اس نے 'ست سری اکال کا نعرہ' بلند کیا اور کرپان نکال کر پٹھان کو وہیں ٹھنڈا کر دیا۔

شواجی پارک میں ہندو۔ مسلم دنگے کا یہ پہلا واقعہ تھا۔ پولیس جانچ کے لئے آئی مگر مجرم کا پتہ نہ چلا۔ اسی رات غنڈوں نے ایک کمیٹی بلائی، دوہتڑ سنگھ کی پیٹھ ٹھونکی اور فیصلہ کیا کہ شواجی پارک سے سارے مسلمانوں کو ختم کر دیا جائے۔ اس کام کے لئے سردار دوہتڑ سنگھ کو سب غنڈوں کا سردار مقرر کیا گیا۔

دوسری رات کو سردار دوہتڑ سنگھ نے اپنے ساتھیوں کی مدد سے کئی مسلمانوں کا قتل کر دیا۔ ان میں کئی غنڈے تھے اور اس فساد کے شروع ہونے سے پہلے ہندو غنڈوں کے ساتھ رہ کر شہریوں کو بلیک میل کیا کرتے تھے۔

امجد نے مرتے مرتے کہا، 'ارے دھارکر، زندگی بھر تیرا ساتھ رہا ہے۔ یاد ہے۔ جب ہم نے مل کر سیٹھ دلپت کی بے عزتی کی تھی؟ جب سکروان جی پارسی کو سمندر میں ڈبویا تھا؟ جب ایرانی ہوٹل والے کو لوٹا تھا؟ اور آج تو ہم پر ہی تلوار لیکر چڑھ آیا ہے دوست!'

دھارکر نے پریشان ہو کر کہا، 'کیا کروں دوست، مجبوری ہے۔ ہندو دھرم کا معاملہ آن پڑا ہے۔ ورنہ کوئی بات نہیں تھی۔'

ست سری اکال کہہ کر دوہتڑ سنگھ نے امجد کا سر اڑا دیا۔

اگلے روز شواجی پارک اور اس کے آس پاس کے علاقے کو مسلمان خالی کرنے لگے۔ وہی فلیٹ جو دس ہزار پگڑی پر بھی نہیں مل سکتے تھے، اب دو ہزار پر جانے لگے۔

موٹریں جو پندرہ۔ سولہ ہزار کی مالیت کی ہونگی پندرہ سو میں بکنے لگیں۔ بجلی کے پنکھے، ریڈیو گرام ہر مہنگی چیز کوڑیوں کے مول بکنے لگی۔

یہ سب سردار دو ہتڑ سنگھ کی رہنمائی کا نتیجہ تھا۔ اب گجراتی سیٹھ انہیں ہاتھ جوڑ کر نمسکار کرتے تھے۔ گجراتی سیٹھانیوں نے اس کے گلے میں ہار پہنائے۔ امجد کی خوبصورت مرہٹھا بیوی اس نے اپنے یہاں رکھ لی اور اسے امرت چکھا دیا۔ ہر روز شراب کی بوتل اس کے پاس پہنچ جاتی اور سو۔ پچاس روپے بھی اب وہ سیٹھوں کی محفل میں رہتا تھا، ان کی موٹروں میں گھومتا تھا اور گلی بازاروں میں اکڑ کر ایسے چلتا تھا جیسے شواجی پارک کا مالک وہی ہے!

اب سردار دو ہتڑ سنگھ کے بدن سے لائل پور کی سوندھی سوندھی مٹی کی بو نہیں آتی تھی۔ اب اس کے جسم کے ذرّے ذرّے سے لالچ اور خون کی بو آتی تھی۔ اب اس کی زبان پر ماہیا اور ہیر کے گانے نہیں تھے، اب وہ فلموں کے بازارو گیت گاتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں اب ہل نہیں تھا، خنجر تھا۔

دو ہتڑ سنگھ مر گیا تھا، وہ جو لائل پور کا کسان تھا۔ وہ دو ہتڑ سنگھ اب زندہ تھا جسے دو طوفانوں کی ٹکر نے پیدا کیا تھا۔ اب وہ ہندو دھرم کی عزت کا محافظ تھا اور جن لوگوں نے اس کے ذریعے فلیٹ حاصل کئے تھے، موٹر حاصل کی تھی اور پھر انہیں بازار میں ہزاروں کے منافے پر بیچا تھا، اس کے قدموں پر بچھے جاتے تھے اور اس کا استقبال دیوتاؤں کی طرح کرتے تھے۔

اب یہ طوفان بھی گذر چکا ہے۔ مسلمان شواجی پارک سے نکال دیئے گئے۔ کہیں کہیں اکادکا مسلمانوں کا گھر رہ گیا ہو تو رہ گیا ہو، مجھے اس کی خبر نہیں۔ ہاں 'اتنا ضرور جانتا ہوں کہ زندگی پھر اب پرانے ڈھرّے پر آ چلی ہے۔ لوگ باگ پھر رات کو گھروں سے سیر کرنے کے لئے نکلنے لگے ہیں۔ عورتوں اور بچّوں کے قہقہے بھی سنائی دینے لگے ہیں۔ سمندر کے کنارے دہی بڑے والے، پھول والے ناریل بیچنے والے گھوم رہے ہیں۔ ٹھیلوں پر شمع روشن ہے اور گجراتی سیٹھوں کی قیمتی گاڑیاں جھناٹے کے ساتھ گزر

جاتی ہیں اور آدمی انہیں دیکھتا رہ جاتا ہے۔

دوہتڑ سنگھ کی ضرورت اب ختم ہو چکی ہے۔ اس کے گھر اب شراب کی بوتل نہیں پہنچائی جاتی۔ نہ سو پچاس روپے کی آمدنی ہے کوئی اب اس کے گلے میں پھولوں کا ہار نہیں پہناتا، اسے ہندو دھرم کا محافظ نہیں بناتا۔ بڑے۔ بڑے سیٹھ جو فساد کے دنوں میں خود اس کے گلے میں ہاتھ ڈالے پھرتے تھے اب اس کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتے۔

دوہتڑ سنگھ طوفان کا اکھڑا ہوا پودا ہے۔ ڈول رہا ہے۔ زہر اس کی رگ رگ میں پہنچ چکا ہے۔ اس کے حمایتی ایک ایک کر کے الوداع کہہ چکے ہیں۔ مگر ایک معقول تعداد ابھی باقی ہے۔ کم تنخواہ والے کلرک، دھوبی، نائی، کنجڑے، ڈرائیور، کرخندار، بیکار زندگی کے ستائے ہوئے لوگ اور غنڈے جنہوں نے کبھی ماں کا دودھ پیا تھا اور آج زندگی کا زہر پیتے ہیں۔ یہ لوگ سوچتے ہیں کہ مسلمان چلے گئے، لیکن بیکاری ختم نہیں ہوئی۔ کپڑا نہیں ملتا مکان نہیں ملتا تنخواہ نہیں بڑھتی۔ مسلمان چلے گئے لیکن چیزیں سستی نہیں ہوتیں۔ ہاں، امیروں کے پاس موٹریں اسی طرح ہیں ان کے گھروں میں وہی شان و شوکت ہے ان کے کارخانے اسی طرح چلتے ہیں۔

مسلمان چلے گئے، بھگا دیے گئے مار ڈالے گئے

لیکن دوہتڑ سنگھ پہلے کی طرح بدستور بھوکا ہے۔

دو۔ چار روز تو اس نے صبر کیا پھر پریشان ہو کر اس نے سیٹھ دلپت کی موٹر روک لی۔ کہا! 'سیٹھ تمھارے وعدے کدھر گئے؟'

سیٹھ نے رکھائی سے کہا، 'کیسے وعدے؟'

'وہی کہ میں یہ کروں گا، میں وہ کروں گا۔'

'کیا نہیں کیا میں نے؟ اور کیا مانگتا ہے؟ یہ لے پانچ روپے۔'

'پانچ روپے نہیں چاہیے۔ وہ تیرے آدمی کو جو کرنل مشرف کا فلیٹ دلوایا تھا، اس کا کمیشن پانچ سو بنتا ہے۔ وہ بولتا تھا دوں گا، ابھی تک دیا نہیں۔'

'تو مجھ سے کیوں مانگتا ہے ؟ راستے میں موٹر روک کے کھڑا ہے سالا، پولیس میں چالان کرادوں گا۔'

'پولیس میں چالان کرادیگا۔' دو ہتڑ سنگھ گرجا، تیری بہن دی . . .

کرسم سے موٹر اس کے ہاتھوں سے نکل گئی اور وہ سڑک پر گر کر مرتے مرتے بچا۔

رات کو اس نے سیٹھ دلپت کے آدمی کو قتل کر دیا جس نے پگڑی کا کمیشن نہیں دیا تھا۔ اب انہیں مرہٹا سیٹھوں نے اسے گرفتار کرادیا جنہوں نے بیسوں مسلمانوں کے قتل ہونے پر اسے پولیس کے ہاتھوں سے بچالیا تھا، جھوٹی گواہیاں دے کر۔ اب وہ ہندو دھرم کا محافظ نہیں رہا تھا۔ اب وہ شواجی پارک میں امن کا دشمن تھا۔

۱۔ وہ پنجابی تھا۔

۲۔ وہ پنجابی غنڈا تھا۔

۳۔ وہ سکھ تھا۔

۴۔ وہ سکھ قاتل تھا۔

۵۔ اس نے ایک مسلمان عورت کے آدمی کا قتل کر کے اس کی عورت کو اپنے گھر میں رکھ لیا تھا۔

۶۔ اس نے دلپت سیٹھ مارواڑی کی موٹر روک لی تھی۔

۷۔ موٹر روک کر اس نے قتل کی دھمکی دی تھی۔

۸۔ اس نے سیٹھ دلپت کے ساجھی دار کا قتل کر دیا تھا اور اس فلیٹ میں دوسرے لوگوں کو قتل کرنے جا رہا تھا کہ اس کو پولیس نے گرفتار کر لیا۔

۹۔ وہ شواجی پارک میں جہاں صرف شریف لوگ بستے ہیں امن کے لئے خطرہ تھا۔

ان الزاموں کی بنا پر اسے نو دفعہ پھانسی کی سزا ہو سکتی تھی لیکن اسے صرف ایک دفعہ پھانسی کی سزا ہوئی اور وہ پھانسی پر چڑھا دیا گیا اور اس طرح دو ہتڑ سنگھ سردار قوم سکھ، عمر تیس سال، ساکن لائل پور مر گیا۔ تاریخ مرنے کی ۲۰ر اکتوبر ۱۹۴۷ء۔

لیکن میرا خیال ہے کہ وہ اس سے بہت پہلے مر چکا تھا مار ڈالا گیا تھا۔ سردار دو ہتڑ

سنگھ جو لائل پور کا کسان تھا جس کی عمر تیس سال تھی اور جو ماہیا اور ہیر گایا کرتا تھا اور ہر روز اپنے کھیت پر کام کرتا تھا جس کے دو بوڑھے ماں باپ تھے اور ایک نوجوان شرمیلی بیوی تھی اور شریر آنکھوں والے معصوم بچے۔ وہ سردار پندرہ اگست کو مار ڈالا گیا۔

یہ قتل آپسی سمجھوتے سے ہوا تھا۔ اس میں کانگریسی بھی تھے اور لیگی بھی اور ہر وہ ہندوستانی جس نے اپنے آرام کی خاطر پنجاب کی روح کے دو ٹکڑے کر دیئے تھے۔

دل کا چراغ

سویرے جو کل آنکھ میری کھلی، تو چار بجے تھے اور خواب گاہ کی کھڑکی کے سامنے سڑک کے اس پار سکھ دکاندار کی دکان سے سکھ منی جی کے پاٹھ کی آواز آ رہی تھی۔ لہجے سے صدق۔ عجز، اور پاکیزگی کا اظہار ہو رہا تھا۔ لیکن آواز ذرا منجھی ہوئی تھی، اس لئے برابر چلی آ رہی تھی، ایسی آواز جو اپنی پاکیزگی کے باوجود میرے کانوں کو تیز معلوم ہوئی۔ گویا کہہ رہی تھی مردود تجھے اپنے خالق کا کچھ پاس نہیں کسی میٹھی نیند سو رہا ہے، شرم نہیں آتی تجھے، دیکھ ستارے ماند پڑ رہے ہیں۔ مشرق سے روشنی پھوٹ رہی ہے۔ اور میں اپنے قادر مطلق کی تعریف کا گیت بن کر آسمان کی طرف اُٹھ رہی ہوں اُٹھ، اُٹھ، بے شرم، کافر، ملحد، دہریئے، آواز اُونچی ہو رہی تھی تھراتی ہوئی لرزتی ہوئی۔ گویا اپنے آپ کو ربِّ عظیم کے آستانے پر نچھاور کرتی ہوئی میری کھڑکی کے اندر چلی آ رہی تھی۔ میں نے نیند سے بھرے ہوئے پپوٹوں کو اٹھائے بغیر ہی کھڑکی کے پردے گرا دیئے۔ کھڑکی بند کر دی، اور لحاف منہ اور سر کے گرد اچھی طرح لپیٹ کر سو گیا۔ لیکن میرے اللہ وہ آواز ابھی تک آ رہی تھی۔ اور اب تو گویا چلا چلا کر کہہ رہی تھی، اُٹھ، اُٹھ،

"اُٹھ فریدا سُتّیا تے من دا دیوا بال" (اے سوئے ہوئے فرید، اُٹھ، اور دل کا چراغ روشن کر دے۔)

گو میرا نام فرید نہیں، لیکن پھر بھی میں نے اب یہی مناسب سمجھا کہ بستر پہ اُٹھ کر

بیٹھ جاؤں اور میز پہ پڑے ہوئے ٹیبل لیمپ کو روشن کر دوں۔ جب کمرے میں اجالا ہو گیا تو روشنی اور آواز دونوں نے مل کر نیند کا میٹھا تسکین دہ خمار میری آنکھوں سے بالکل دور کر دیا اب مجھے آنکھوں میں ایک جلن اور چبھن سی محسوس ہو رہی تھی اور ایسا معلوم ہوا کہ یہ آواز نہ تھی بلکہ سوئیاں اور کانٹے تھے جو میری آنکھوں میں چبھ رہے تھے میں نے آنکھیں ملتے ہوئے کھڑکی کھول دی ایک زنّاٹے دار آواز ہوئی۔

"اُٹھ فریدا سُتیا تے من دا دیوا بال
صاحب جنھاں دے جاگدے نفراں کی سونے نال"

اور جب تیرا صاحب جاگ رہا ہو تو اے بہرے کے بچے تجھے سونے کا کیا حق ہے!)

بالکل درست، پیر و مُرشد، بالکل درست، آج کی خطا معاف ہو، کل اگر چار بجے سے پہلے ہی نہ اُٹھوں تو پھر ـــــ بھلا آپ کی آواز ہی مجھے کیوں چین لینے دے گی؟

میں نے کھڑکی سے باہر دیکھا، تو سامنے سکھ دکان دار کی دکان پہ کوئی جھاڑو دے رہا تھا۔ ٹین کے ڈبوں کو جھاڑ کر اپنی جگہ رکھ رہا تھا۔ آٹے اور دال کی بوریوں کو اُٹھا اُٹھا کر قرینے سے سجا رہا تھا، یہ وہ بے چارہ کوتاہ قد زرد رو سکھ دکان دار تو نہ تھا۔ یہ تو کوئی اور تھا۔ شمع کی ہلکی سی لَو میں اس کی لمبی پرچھائیں، اُس کا چُست پائجامہ، اور کاندھوں کے گرد لپٹا ہوا کھیس نظر آ رہا تھا یا پھر وہی صدائے برحق۔

گن گاویں تے من بھاویں (اپنے گورو کی تعریف کر، تاکہ تو اس کے دل میں گھر کر سکے۔)

جی!
گُن گاویں تے من بھاویں

جی!

جی! بالکل درست، پیر و مُرشد، بالکل درست، اگر میں اپنے دفتر کے سپرنٹنڈنٹ کی دن رات خوشامد نہ کرتا تو آج محض ایک "ایف۔ اے فیل" ہو کر پچھتر روپے تنخواہ نہ پاتا۔

"جی، ست سری اکال!" اب وہ لمبی پرچھائیں دکان کے باہر آگئی تھی۔ جس نعرے نے گورو نانک نگر کے در و دیوار ہلا دیئے تھے، وہ نعرہ میری کھڑکی کھلی دیکھ کر ہی لگایا گیا تھا۔

"آہا، بابو جی، آج تو آپ" بڑے سویرے "اُٹھ بیٹھے۔ لمبی پرچھائیں نے کہا۔

میں نے مسکرانے کی کوشش کی۔

"بابو جی، سویرے اُٹھنا بہت اچھا ہوتا ہے۔ اب تو خیر بہت اجالا ہو گیا ہے۔"

میں نے آسمان کی طرف نگاہ اُٹھائی، گھٹا ٹوپ اندھیرا، ابھی تو چار ہی بجے تھے، ستارے چمک رہے تھے، اور بجلی کے کھمبوں پہ قمقمے بھی۔ اجالا کہاں ہے، میں نے سوچا، پھر خیال آیا کہ یہ معرفت کی باتیں ہیں، تو بے وقوف انھیں کیا جانے۔ جس کے دل میں اُجالا ہوتا ہے۔ اسے ہر طرف اُجالا ہی اُجالا دکھائی دیتا ہے۔

میں نے پوچھا، یہ ـــــ دکان کے ـــــ نند سنگھ جی کہاں ہیں؟

گھر پر ہی ہیں جی، وہ تو ابھی سو رہے ہوں گے جی، میں نے سوچا چلو، ان کے گھر مہمان بن کر آیا ہوں تو کچھ سیوا ہی کر لوں، کر سیوا۔ کھا میوہ، میرا نام درشن سنگھ ہے جی، میں نند سنگھ جی کے بڑے سالے کا بڑا لڑکا ہوں، جی، میں نور پور میں گرنتھی ہوں، نند سنگھ جی ذرا بیمار رہتے ہیں، اُنھیں مرگی کا دورہ پڑتا۔ آپ کو تو پتہ ہی ہوگا۔ واہگورو مہاراج سب کا بھلا کرے، تو ـــــ انھیں نے مجھے یہاں بلا لیا ہے ذرا دکان کے کام کاج میں مدد ہو جاتی ہے۔ میں یہیں دکان پر سویا کروں گا۔ واہگورو، واہگورو، اب تو دن چڑھ گیا ہے! او بنئے او بنئے، اُٹھ دکان کھول۔ کیا دیکھتا ہے۔ دن کبھی کا نکل آیا ہے۔

درشن سنگھ بنئے کو آوازیں دینے لگا، بے چارہ بنیا اس مکان کی نچلی منزل میں جہاں میں رہتا ہوں۔ آٹا۔ لون۔ تیل۔ سبزی سوڈا واٹر اور پکوڑے بیچتا ہے۔ اس کی بیوی کا رنگ ذرا کھلتا ہوا سا ہے اور وہ ہمیشہ مینا کی طرح چہکا کرتی ہے، دکان پر کام کرتی ہے۔ گاہکوں کو مسکرا کر سودا دیتی ہے۔ نگر کے کنوارے لڑکے، بدصورت بیویوں کے ادھیڑ خاوند، پوربیئے، دھوبی۔ نائی۔ موچی اور اکھاڑے میں کشتی لڑنے والے پہلوان سبھی بنئے کی دکان سے سودا لیتے ہیں، کرسی پر بیٹھ کر پکوڑے کھاتے ہیں، بڑی رغبت سے، یا

بنئے کی بیوی سے "سوڈا واٹر کی ایک بوتل کھول دینا" اور "آج تو بنیائن خوب بنی ٹھنی ہو "
"ہی ہی ہی ......"

اور بنئے کی بیوی بوتل سے کاگ اُڑاتے ہوئے کہتی ہے "ہٹ مردود"

دوسرے دن درشن سنگھ کے پہلے مصرعے نے ہی مجھے جگا دیا۔ گھڑی کی طرف دیکھا تو کم بخت پورے چار تھے، میں نے سوچا یہ آدمی ہے یا گھڑیال، میں نے لحاف میں مُنہ چھپا کر اپنی بدبختی پر رونے کی کوشش کی، لیکن جلتی ہوئی آنکھوں میں آنسو کیسے آتے، میں نے درشن سنگھ کو، اس کے آباؤ اجداد کو، اپنی قسمت کو، فرید بابا کو لاکھ لاکھ کوسنے دیئے۔ اتنے میں میں نے سُنا کہ نچلی منزل سے بھی ایک ہلکی ہلکی صدا اُٹھ رہی ہے۔

اوم، جے جگدیش ہرے۔
جے جگدیش ہرے اے اے ....

بنیا اپنی پھٹے ہوئے ڈھول کی سی آواز میں گا رہا تھا وہی صدق، عجز اور پاکیزگی، لیکن کچھ خاص قسم کی تیزی۔ جو گویا درشن سنگھ سے کہہ رہی تھی، تم ہمیں کیا سمجھتے ہو، ہم تم سے ہیٹے نہیں ہیں۔ ہمیں بھی اپنا بھگوان کچھ کم پیارا نہیں۔

اونہہ!

اور اب بنیا اور اس کی بیوی اور دونوں بچے اپنی ملی جُلی آوازوں کے ساتھ کہہ رہے تھے۔

بھگت جنن کے سنکٹ چھن میں دور کرے (وہ اپنے بھگتوں کے دُکھ ایک پَل میں دور کر دیتا ہے۔)

اوم
جے جگدیش ہرے اے اے
اور بنئے کی بیوی کوئل کی طرح کوک کوک کر کہہ رہی تھی؛
تُم بن اور نہ دُوجا۔

تُم بن اور نہ دُوجا۔
آس کروں جس کی
اوم جے جگدیش ہرے ہرے۔

ایک درمیانی وقفے میں درشن سنگھ نے خوش ہو کر بنئے سے اُونچی آواز میں کہا۔" بنیا جی، آہا واہگورو کا نام لینے میں کتنا آنند ہے؟

بنئے نے پُر خلوص لہجے میں کہا، آہا، رام کی مہما ——— اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔

درشن سنگھ کے آتے ہی نگر میں دھرم کرم کے چرچے ہونے لگے، یہ نگر لاہور ہی کی آبادی کا ایک حصّہ ہے یہاں اس لئے کوئی خاص مذہبی مجلسیں قائم نہ ہوئی تھیں لے دے کر ایک سنگھ سبھا تھی۔ جس کا اجلاس سال میں شاید ایک مرتبہ ہی ہوتا تھا، جس مکان میں میں رہتا تھا، اس سے بس دس پندرہ قدم آگے جا کر مغرب کی طرف ایک مُسلمان قلعی گر، ایک مسلمان رنگساز ایک مسلمان حکیم اور ایک مسلمان سائیکل کے مستری اور ایک مسلمان سبزی فروش کی دکانیں تھیں۔ ان سے آگے کُھلی جگہ تھی جہاں اکھاڑہ بنا ہوا تھا۔ یہاں سکھ۔ مُسلمان۔ ہندو اور چمار پہلوان سب اکٹھے ہو کر کشتی لڑا کرتے تھے۔

لیکن درشن سنگھ کے آتے ہی لوگوں میں گویا صدق و ایمان کی روح پھونکی گئی۔ ست سری اکال اور اوم جے جگدیش ہرے کے بعد مُسلمان رنگ ساز نے یہ مناسب سمجھا کہ نورِ ایمان مُردہ دلوں میں تازہ کیا جائے، چنانچہ اب کچھ دنوں سے اس کی دکان پر ایک سبز منکوں والے اور سبز چُغے والے پیر جو بیک وقت پیر اور مولوی اور عامل تھے تشریف لانے لگے، اب رنگ ساز کی دکان پر ہمیشہ ایک جمگھٹا سا لگا رہتا تھا۔ اللہ اکبر کی صدائیں بلند ہوتی تھیں، اور سائیکلوں کے مستری کے نوجوان لڑکے یا علی، یا علی کرتے اور خوشی سے ناچتے ہوئے گزر جاتے تھے۔ مُسلمان سبزی والے کا تمبا کو کا خرچ بڑھ گیا تھا، اور حکیم صاحب ایک دن اپنے چھوٹے لڑکے کو بنئے کی دُکان پر پکوڑیاں کھاتے ——— دیکھ کر غصے میں آکر پیٹنے لگے۔

پھر جب غصہ ٹھنڈا ہوا تو بولے " یہ کم بخت ہمیشہ گندی چیزیں کھاتا ہے۔ میں نے

اسے سو بار سمجھایا ہے ۔"

چند روز کے بعد جب میں ایک شام کو دفتر سے تھکا ماندہ واپس آرہا تھا تو کیا دیکھتا ہوں کہ نگر کا بازار جھنڈیوں سے سجا ہوا ہے ، اور بازاروں میں سنگھ سبھا کے والنٹیر ٹولیاں بنائے جگہ جگہ کھڑے ہیں ۔ جن میں سے کئی ایک نے گلے میں ہار پہن رکھے ہیں ۔ اکثر لوگ پان چبا رہے ہیں ، قہقہے لگا رہے ہیں ۔ ننھے ننھے سکھ لڑکے بھی کرپانیں پہنے ہوئے ہیں اور اُبلے ہوئے چنے کھا رہے ہیں ۔ یا کھٹے کچالو ۔ یا پلیٹوں میں جمی ہوئی سُرخ سُرخ چینی گھاس کی کھیر ۔
درشن سنگھ نے مجھے دیکھتے ہی ست سری اکال کا جے کارہ لگایا ۔" آہا ، بابو جی ، آج باباجی رہا ہو گئے ، "

" کون سے باباجی ؟ "

"واہ ـــــــ آپ کو بھی پتہ نہیں ، آپ تو روز اخبار پڑھتے ہیں ، وہی واہگورو جی کے سچے خالصہ بابا ٹھیک سنگھ جی "

بنیئے کی دکان پر کھڑے ہوئے ایک والنٹیر نے کہا ۔ زندہ شہید ، بابا ٹھیک سنگھ جی رہا ہو گئے ہیں ، آج ہم ان کو ایڈریس دیں گے ۔"

"بڑی خوشی کی بات ہے " میں نے کہا ۔

ساتھ والے مُسلمان قلعی ساز کی دکان پر شہید گنج کا مسئلہ چھڑا ہوا تھا اور "گرما گرم" بحث ہو رہی تھی ۔

دوسرے دن میری نیند روز کی طرح اُچاٹ ہو گئی ۔ لیکن باقی آوازوں کے ساتھ ہی ایک ریکارڈ بھی بج رہا تھا ۔ مکان کے دوسرے حصے میں میری طرح ایک اور کرایے دار رہتا تھا ، میری ہی طرح ایک دفتر میں ملازم تھا اور اب وہی مُنہ اندھیرے اُٹھ کر ریکارڈ بجا رہا تھا ۔

نو بجے کے قریب وہ مجھے سیڑھیوں پر ملا ۔ میں نے ایک پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ اس سے کہا ، آج تو آپ صبح ہی اُٹھ بیٹھے ۔"

"ہو ہو ہو " بابو جی نے ہنستے ہوئے کہا " ہاہاہا ۔ مجھے مہا تما جی کا ریکارڈ بہت

پسند ہے، آپ کو پتہ ہے۔ مہاتما جی کو یہ گیت خاص طور پر پسند ہے۔"

کونسا گیت؟

"یہی جس کا میں صبح ـــــ ریکارڈ بجا رہا تھا، اُٹھ جاگ مُسافر بھور بھئی" کیسا میٹھا گیت ہے، اسے صبح سُن کر طبیعت بشّاش ہو جاتی ہے۔"

اور پھر وہ یہ گنگناتا ہوا سیڑھیوں سے نیچے اُتر گیا۔

"اُٹھ جاگ، اُٹھ جاگ، مسافر بھور بھئی، اب رین کہاں، جو سووت ہے۔ اے۔ اے"

پرسوں ایک حادثہ ہو گیا تھا، گوشت سے بھرے چھکڑے یا تانگے بوچڑ خانے سے آتے ہوئے اسی طرف سے گزرتے ہیں میونسپلٹی کی سڑک پر بہت سے گڑھے پڑ جانے کی وجہ سے اکثر چھکڑوں کے بیل یا تانگوں کے گھوڑے چوٹ کھا کر گر پڑتے ہیں۔ اور کئی بار گوشت زمین پر گر جاتا ہے۔ چنانچہ پرسوں بھی ایک تانگہ سکھ دکان دار کی دکان کے سامنے اُلٹ گیا، اور گوشت دکان کے قریب زمین پر گر پڑا۔ تانگے والے کو بہت سی چوٹیں لگیں۔ چنانچہ پرسوں شام ہی کو "پریم سبھا" کے سکریٹری میرے پاس آئے اور بولے، "اس کا تدارک ہونا چاہیئے"

میں نے کہا "ٹھیک ہے، میونسپلٹی کو لکھ دیجئے"

"بولے "نہیں آپ میری بات نہیں سمجھے۔ یہ راستہ ہی بوچڑوں کے لئے بند ہو جانا چاہیئے۔ یہ ہندو سکھ آبادی ہے، ہماری توہین ہوتی ہے۔ ہمارے جذبات کو ٹھیس لگتی ہے۔ اس کے علاوہ آپ دیکھئے نا، یہاں چھوٹے بچے، لڑکے بالے گھومتے رہتے ہیں اگر کسی کے چوٹ لگ جائے، اگر کوئی مر جائے تو ـــــ"

میں نے کہا یہ تو درست ہے۔ مگر بوچڑ خانے کا بھی تو یہی راستہ ہے۔ اور ـــــ"

پریم سبھا کے سکریٹری بولے "آپ کیسی باتیں کرتے ہیں۔ آپ ہمیں اخبار میں خبر بھیجنے کے لئے ایک مسودہ بنا دیجئے"

میں نے کہا۔ "یہ پریم سبھا کب بنی ہے؟"

وہ بولے۔ "تین چار دن ہوئے، یہاں چار پانچ ہندوؤں نے مل کر بنائی ہے،

آپس میں مل بیٹھنا اچھا ہوتا ہے۔"

پنڈت سدھ دیو کے دو لیکچر بھی ہو چکے ہیں۔ سبھی لوگ آئے ہوئے تھے، آپ کہاں رہے؟"

"میں؟" ــــ میں نے کہا۔ "کس مضمون پر لیکچر ہوئے تھے!"

"جاپان میں ویدک دھرم!" نہایت اعلیٰ لیکچر تھا۔ پنڈت جی نے ثابت کر دیا کہ ساری دُنیا دھرم قبول کرنے کو تیار ہے، مگر ہم لوگ بہت سُست ہیں۔ وہ کہتے تھے کہ ہمیں ساری دُنیا میں اپنے پرچارک بھیجنے چاہئیں، انھوں نے بتایا کہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "

میں نے کہا۔ "میں کل آپ کو مسودہ تیار کر دوں گا۔"

دوسرے دن صبح ہی یہاں ایک فساد ہو گیا۔ ہندو۔ مُسلم۔ سکھ فساد، خوب گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ ساری نو آبادی میں ہراس پھیل گیا، اِکّے دُکّے پر کرپانوں اور چھریوں سے حملے ہونے لگے، سکھوں کی کرپانوں نے، بوچڑوں کی چھریوں نے اور پوربیوں کی لاٹھیوں نے خوب دادِ شجاعت دی، صبح سے لے کر دوپہر تک نعرے بلند ہوتے رہے۔

پریم سبھا کے سکریٹری نے شام ہی کو للکار کر کہہ دیا تھا۔ کہ بوچڑوں کو اس بازار میں سے گزرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ بوچڑوں نے سر بازار کہہ دیا تھا کہ وہ صبح اسی سڑک پر سے گزریں گے اور ضرور گزریں گے۔ اور دیکھیں گے کہ کون مائی کا لال انھیں روکتا ہے۔

دوسرے دن صبح ہی بوچڑ اپنے چھکڑوں اور تانگوں پر گوشت لادے ہوئے گذرنے لگے۔ سبھی خاموش تھے۔ کسی کی ہمت نہ پڑی کہ انھیں روکتا۔ کہ اتنے میں درشن سنگھ نے للکارا "ٹھہر جاؤ" اور کرپان لے کر میدان میں آگیا۔

مُسلمان رنگ ساز نے کہا۔ "اللہ۔ ہو۔ اکبر۔"

بنیا جلد جلد اپنی دکان بند کرنے لگا، وہ اسی دکان میں اپنی بیوی اور دو بچّوں کے ساتھ رہتا تھا۔ میں نے بھی نچلی منزل کا بڑا دروازہ بند کرا دیا، اور پھر تماشا دیکھنے کے لئے کھڑکی میں آبیٹھا، لیکن ذرا ہٹ کر، تاکہ کہیں کوئی اینٹ میرے ہی نہ آ لگے۔

پریم سبھا کے حمایتی پوربیوں نے ہلّہ کر کے مُسلمان حکیم اور رنگ ساز اور سائیکل اور

سبزی والے کی دُکانیں لوٹ لیں سکھ اور بوچڑ لڑ رہے تھے، اتنے میں گھائی دروازے سے ٹک پہنچ گئی اور مہنت نگر سے بپھرے ہوئے ہندو بھی۔ میں نے مصلحتاً کھڑکی بند کر دی۔ میری کھڑکی پر اینٹیں پھینکی جا رہی تھیں، بنئے کی دُکان توڑی جا رہی تھی۔

چیخیں، دردناک، ہیبت ناک چیخیں، نعرے۔ فلک شگاف نعرے، لاٹھیوں کے چلنے کی آوازیں۔

دکانوں کے دروازے ٹوٹنے کی آوازیں۔

دو تین گھنٹوں کے بعد یک لخت چاروں طرف موت کی سی خاموشی چھاگئی۔ اب فساد مہنت نگر سے آگے بڑھ کر دوسرے محلّوں نو آبادیوں اور شہر کی گلیوں کوچوں میں پہنچا ہوا معلوم ہوتا تھا، دور دور نعروں کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں، لیکن یہاں ــــــ موت کی سی خاموشی تھی۔

میں نے چند منٹ کے سکوت کے بعد آہستہ سے کھڑکی کا پٹ کھول کر دیکھا۔

دُکانیں لُٹی پڑی تھیں، اشیاء بازار میں بکھری ہوئی تھیں چند بوچڑ اور سکھ مرے پڑے تھے۔ کئی زخمی پڑے کراہ رہے تھے۔ جن میں میرا پڑوسی بنیا بھی تھا اور اس کی بیوی بھی، جو اسے بچانے کی کوشش میں بُری طرح زخمی ہوگئی تھی۔ وہ میری کھڑکی کے نیچے پڑی تھی۔ اسے اس حالت میں پڑے دیکھ کر اس کی وہ تصویر میری آنکھوں میں پھر گئی۔ جب میں نے اسے ایک دن نچلی منزل میں راکھی کے روز دیکھا تھا۔ میں دالان میں کھڑا سائیکل صاف کر رہا تھا کہ وہ بے تحاشا بھاگتی ہوئی آکھڑی ہوئی۔ اس کا ہنستا ہوا چہرہ، رنگین کنارے والی دھوتی اور سڈول بازو! مجھے ایسا معلوم ہوا تھا کہ ساری دُنیا خوبصورت رنگوں سے معمور ہوگئی تھی ـــ اور پھر دوسرے لمحے ہی میں وہ میرے سامنے سے غائب ہوگئی تھی، لیکن اس کی وہ حسین تصویر، وہ رنگین پرچھائیں ایک عرصہ تک میرے آئینۂ دل پر لرزتی رہی تھی۔

اور اب؟

جب میں نے پھر کھڑکی بند کی تو سائیکلوں کا بوڑھا مستری اپنے نوجوان لڑکے کی لاش کو اپنے کاندھوں پر اُٹھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

فساد کو ایک عرصہ ہو چکا ہے ۔ اب یہاں امن امان ہے فجو اور ماتا دین کو پھانسی کی سزا ہو چکی ہے ۔ بنیا اپنے بال بچوں کو لے کر رہتک چلا گیا ہے ، بوڑھا مستری جس کے دونوں بچے فساد میں ہلاک ہو گئے تھے اب گردن جھکائے سائیکل درست کرتا ہوا نظر آتا ہے ، درشن سنگھ کا کوئی پتہ نہیں ۔ نند سنگھ نے مجھے ایک دن آہستہ سے بتایا کہ وہ آج کل شکار پور میں گرنتھی ہے ، اور اب اس نے اپنا نام سکھ چین سنگھ رکھا ہوا ہے۔ مسلمان رنگریز نے کہا کہ سبز چوغے والا مولوی آج کل جلال پور کی مسجد میں امام ہے ۔ اب آہستہ آہستہ لوگ ایک دوسرے سے اچھی طرح ملنے جلنے لگے ہیں ، پریم سبھا کا سکریٹری ، اب رادھا نگر میں رہتا ہے ۔ بوچڑ لوگ گوشت کو ڈھانپے ہوئے اسی طرح سڑک پر سے گزرتے ہیں ۔ سڑک پر میونسپلٹی کے گڑھے اسی طرح موجود ہیں لیکن تعزیری پولیس ضرور تعینات کر دی گئی ہے ۔

اب مجھے صبح چار بجے کوئی نہیں جگاتا ۔ بابو جی ، جو دوسرے حصے میں ہیں اب ریکارڈ نہیں بجاتے ۔ کیوں کہ وہ فساد میں ٹوٹ گئے تھے ۔ اب کوئی "دل کا چراغ" روشن کرنے کی کوشش نہیں کرتا ، اب بالکل امن ہے ۔ لیکن میں پھر بھی احتیاطاً اخبار میں ہر روز شکار پور اور جلال پور کی خبریں پڑھ لیا کرتا ہوں" !!

لالہ گھسیٹا رام

سانده کلاں ضلع لاہور کے نیک دل آڑھتی لالہ گھسیٹا رام کو کون نہیں جانتا۔ آپ سانده کلاں کے رئیس اعظم ہیں۔ سارا گاؤں آپ کا مقروض ہے۔ گاؤں کے سارے مکان آپ کے ہاں گروی پڑے ہوئے ہیں۔ گاؤں کی ساری بہو بیٹیوں کا زیور آپ کے ہاں رہن ہے۔ اس پر آپ کی شرافت کا یہ حال ہے کہ آج تک کبھی بھولے سے بھی کسی مقروض کی قرقی نہیں ہونے دی۔ اگر وہ سود نہیں دے سکا تو آپ نے سود نہیں لیا۔ انتظار کرتے کرتے کئی سال بیت گئے۔ پر آپ نے نہیں لیا۔ الٹا اپنے پاس سے کچھ اور روپیہ دے کر اسے کاروبار پر لگایا۔ اس طرح سیکڑوں لوگ آپ در یا دلی سے فیضیاب ہوتے رہے اگر کسی نے جھگڑا بھی کیا تو آپ نے ہنسی طرح دی اور بات کو ٹال گئے۔ اگر معاملہ عدالت تک پہنچا تو آپ نے یا دل ناخواستہ اس کے خلاف ڈگری لے لی۔ لیکن اس کی تعمیل کبھی نہیں کرائی۔ لالہ گھسیٹا رام کو ہمیشہ عدالت سے ڈگری مل جاتی تھی کیونکہ عدالت بھی جانتی تھی کہ لالہ گھسیٹا رام

معاملہ کا سچا ہے۔

لالہ گھسیٹا رام کے مزاج میں رواداری گھٹی میں پڑی ہے۔ سانده کلاں میں ہندو کم ہیں اور مسلمان زیادہ ہیں۔ یہ لوگ اپنے کرموں کی وجہ سے ہمیشہ ہندوؤں سے زیادہ ہی مقروض۔ زیادہ ضرورت مند۔ زیادہ پریشان حال دیکھے گئے۔ لالہ گھسیٹا رام اپنے گاؤں کے سارے مسلمانوں کو جانتے ہیں۔ اور ان سے بڑی ملاطفت اور محبّت سے پیش آتے ہیں۔ لالہ گھسیٹا رام کے منہ سے کبھی کسی مسلمان نے کڑوے بول نہیں سنے بلکہ بہت سے ہندو تو یہ کہتے سنے گئے کہ لالہ گھسیٹا رام ہمیشہ مسلمانوں کی طرفداری کرتے ہیں۔ گو اس بات میں کوئی صداقت نہیں ہے کیونکہ لالہ گھسیٹا رام راسخ العقیدہ ہندوستانی ہیں۔ وہ ہر روز پوجا پاٹ کرتے ہیں۔ اپنے گھر میں انہوں نے مندر تعمیر کرا رکھا ہے۔ اس میں روز صبح و شام دو گھنٹے بیٹھتے ہیں اور اپنے معبود کو یاد کرتے ہیں۔ وہ ہندو ہیں مسلمان نہیں ہیں لیکن مسلمانوں سے بڑی رواداری برتتے ہیں۔ ابھی پچھلے سال انہوں نے مسجد کے لئے چندہ دیا تھا۔ اور جمّے موچی کا انتقال ہوا تھا اور اس کی جوان بیٹی اکیلی رہ گئی تو اس کی حفاظت بھی لالہ گھسیٹا رام ہی نے کی تھی اور خود اپنے ہاتھوں سے اس کی شادی سانده خورد کے ایک شریف نیک چلن موچی سے کر دی تھی۔ لالہ گھسیٹا رام کبھی کبھی اس جوڑے کو دیکھنے کے لئے سانده خورد جایا کرتے تھے اور اس لڑکی کی ہتھیلی پر دو چار روپے دھر آتے۔ سانده خورد کا مسلمان نمبردار بھی لالہ گھسیٹا رام کا مقروض تھا اور ہمیشہ لالہ کی شرافت کا پنچایت میں سنہری الفاظ میں بیان کرتا تھا۔

لالہ گھسیٹا رام کی دو بیویاں مر چکی تھیں۔ ان سے چھ سات لڑکے بالے تھے جو اب جوان ہو چکے تھے۔ پھر لالہ گھسیٹا رام نے تیسری شادی کی تھی اور سفید مونچھوں پر خضاب

لگایا تھا۔ مونچھوں پر اور سر کے بالوں میں اور وہ اکثر سانندہ کلاں کے حکیم محمد وارث علوی سے دوائے کے کھاتے رہتے تھے۔ اس عمر میں بھی ان کا رنگ تانبے کی طرح چمکتا تھا اور وہ صبح و شام چار چھ میل پیدل سیر کرنے جاتے۔ سیر کے اوقات میں وہ اکثر مغربی کنویں پر ضرور ٹھہرتے اور تھوڑی دو گھڑی اپنے گاؤں کی بہو بیٹیوں اور ماؤں سے بات چیت کر کے ان سے ان کے گھر حالات پوچھتے اور ان کی تکالیف میں حصہ بٹاتے لالہ گھسیٹا رام کی ذات پر گاؤں کی عورتوں کو بڑا اعتقاد تھا۔ وہ اکثر دوکان پر آتے یا راستے ہی میں انہیں آتے جاتے دیکھ کر ان کا راستہ روک لیتیں۔ اور ان سے نجی معاملات میں مشورہ کی طلب گار ہوتیں۔ تین شادیاں کر کے لالہ گھسیٹا رام گھر کے معاملات پر بڑی قدرت حاصل کر چکے تھے اس لئے ان کے مشورے عورتیں بڑی خوشی سے قبول کر لیتی تھیں۔ کئی گھرانوں کے برسوں کے پرانے جھگڑے لالہ گھسیٹا رام نے اس خوش اسلوبی سے طے کر دیئے کہ دن رات لوگ ان کا جس گاتے تھے۔

لالہ گھسیٹا رام دسہرہ اور عید بڑی دھوم دھام سے مناتے تھے اور دونوں تقریبوں پر مٹھائی بانٹتے تھے۔ وہ مسلم لیگ کو چندہ دیتے تھے۔ کانگریس کو بھی اور سرکاری وار فنڈ میں بھی انہوں نے ایک معقول رقم ڈپٹی کمشنر صاحب بہادر کی معرفت بھیجی تھی جس کے صلہ میں انہیں سرکار عالی نے رائے صاحب کا خطاب عنایت فرمایا۔ اس موقع پر سانندہ کلاں کے ہر فرد نے بڑی خوشی کا اظہار کیا تھا۔ اور گاؤں کی عورتوں نے خوشی سے ڈھولے گائے تھے۔ اور سانندہ خورد کے میراثیوں اور بھانڈوں نے جو لالہ گھسیٹا رام کے مقروض تھے گاؤں والوں کو مفت تماشا دکھایا تھا۔ اس لئے تھوڑے دنوں کے بعد ہی جب سانندہ کلاں میں لوکل بورڈ

بنا تو لالہ گھسیٹا رام متفقہ رائے سے اس کے صدر مقرر ہوئے۔ تھوڑے دنوں میں لوکل بورڈ اور پنچایتی کمیٹی اور کواوپریٹو بنک میں ہر شخص لالہ گھسیٹا رام کے گن گانے لگا۔ کواپریٹو بنک تو ایک طرح سے لالہ گھسیٹا رام کا نجی بنک ہو گیا کیونکہ اس میں سب سے زیادہ حصص لالہ گھسیٹا رام کے تھے۔ دوسرے گاؤں والوں کو ایک دوسرے پر اتنا اعتماد نہیں تھا جتنا لالہ گھسیٹا رام پر تھوڑے ہی دنوں میں لالہ جی کی شہرت سانندہ کلاں اور سانندہ خورد سے آگے بڑھ کر موضع جدو کے میں پہنچ گئی۔ اس موضع میں روئی کی فصل بہت اچھی ہوتی تھی۔ اور شیخ عمر علی اور لالہ پرمانند اس کا بھگتان کرتے تھے مگر اب موضع جدو کے بھی لالہ گھسیٹا رام کے گن گانے لگا۔ یہاں لالہ نے آڑھت کی ایک دوکان کھول دی۔ تھوڑے ہی عرصہ میں گاؤں والے جو اس سے پہلے شیخ عمر علی اور لالہ پرمانند کے مقروض تھے۔ لالہ گھسیٹا رام کے مقروض ہو گئے۔ ان لوگوں میں خود شیخ عمر علی اور لالہ پرمانند بھی بہت جلد شامل ہو گئے۔

پندرہ اگست کے بعد لالہ گھسیٹا رام نے سانندہ کلاں چھوڑ دیا۔ انہوں نے ہمیشہ کی طرح اب کے بھی بڑی ہوشیاری سے کام لیا تھا۔ وہ معدودے چند لوگوں میں تھے جنہوں نے بڑھتے ہوئے طوفان کا اندازہ کر لیا تھا۔ چنانچہ انہوں نے ضلع ہوشیارپور میں ایک چھوٹے سے قصبے سدرنگ میں آڑھت کی ایک دوکان کھول لی تھی اور جالندھر کے ایک بنک میں اپنا کھاتہ بھیج دیا تھا۔ اور اپنی تینوں بیویوں کے زیور اور سرکاری تمسک اور جنگی قرضے کی رسیدیں وغیرہ وغیرہ۔ یہاں پر ان کے پاس لوگوں کے گروی رکھے ہوئے زیورات اور دوسرے

کاغذات اور پچاس ہزار روپے کی رقم ہی باقی رہ گئی تھی۔ جب لالہ گھسیٹا رام سانڈہ کلاں چھوڑنے لگے تو انہیں گاؤں والوں نے رو رو کے روکا مگر وہ نہیں رکے اور انہوں نے اپنے ہاتھ سے سارے زیوران کے کاغذات عورتوں کو ایک ایک کر کے گن گن کے واپس کر دیئے اور نوٹوں کی گڈیوں کو اپنے تہمد کی لپیٹ میں چھپا لیا۔ دوکان انہوں نے شیخ عمر علی کے حوالے کی اور اس سے حصہ داری بھی کر لی پھر انہوں نے سانڈہ کلاں چھوڑ دیا۔ کیونکہ ان کی نسبت پولیس انسپکٹر صاحب خان نے انہیں سانڈہ کلاں سے چلے جانے کا مشورہ دیا تھا۔ چنانچہ وہ پولیس کی ایک لاری میں سانڈہ کلاں سے رخصت ہوئے اور امرت سر با حفاظت پہنچا دیئے گئے۔

سدرنگ کے قصبے میں پہنچکر انہوں نے اپنے پچاس ہزار کے نوٹ گن لئے اور ان میں سے تیس ہزار روپے سے انہوں نے سدرنگ میں ایک بہت بڑی حویلی خرید لی جو قصبے سے ذرا دور باہر کھیتوں میں تھی۔ اور کسی زمانے میں سدرنگ کے ایک بہت بڑے زمیندار کی ملکیت تھی۔ بہت جلد انہوں نے قصبے میں اپنا رسوخ جما لیا۔ ان کی آڑھت کی دوکان چمک گئی کیونکہ غلہ بہت مہنگا ہو رہا تھا۔ اور مغربی پنجاب سے شرنارتھی لاکھوں کی تعداد میں چلے آ رہے تھے اور مشرقی پنجاب سے شرنارتھی یعنی مہاجرین یعنی پناہ گزیں مسلمان لاکھوں کی تعداد میں پاکستان بھاگے جا رہے تھے۔ اس موقع پر لالہ گھسیٹا رام نے شرنارتھیوں اور پناہ گزینوں کی کافی مدد کی۔ انہوں نے قصبہ میں ایک سیوا دل قائم کیا جو آنے والے ہندوؤں اور جانے والے مسلمان دکھیاروں کی دیکھ بھال میں بڑے زور شور سے حصہ لیتا تھا۔ بہت جلد علاقہ میں لالہ گھسیٹا رام کا نام روشن ہو گیا۔

لوگ انہیں اور ان کے جان و مال کو دعائیں دینے لگے۔ علاقہ کے بہت سے لوگ جوق در جوق آکے ان کے پاس اپنا قیمتی سامان گروی رکھنے لگے۔ مکان رہن رکھنے لگے اور اس طرح خوشی خوشی مقروض ہوتے گئے۔ سرکار نے انہیں یہاں دو کانیں الاٹ کر دیں اور ایک مکان بھی رہنے کو دیا۔ جہاں انہوں نے اپنے سیوا دل کا دفتر قائم کر دیا کیونکہ خود تو وہ اس بڑی حویلی میں رہتے تھے جو قصبے سے بہت دور باہر کھیتوں میں واقع تھی۔

علاقہ کے افسر آتے جاتے لالہ گھسیٹا رام کے ہاں ٹھہرتے اور ان کی آؤ بھگت ان کی سوجھ بوجھ اور عقل و دانش کی بے حد تعریف کرتے۔ کئی لوگ تو تعریف میں اتنے آگے بڑھ گئے کہ کہنے لگے لالہ گھسیٹا رام کو تو منسٹر ہونا چاہئے تھا۔ یہ سن کر لالہ گھسیٹا رام بڑی عاجزی سے مسکرانے لگتے۔

۲۰ نومبر ۱۹۴۷ء کو یعنی پندرہ اگست سے تین ماہ پانچ دن بعد لالہ گھسیٹا رام کی حویلی پر پاکستان پولیس کے ایما پر چھاپا مارا گیا اور پولیس نے مسلم مغویہ لڑکیاں برآمد کیں۔ لڑکیوں کے بیان کے مطابق گھسیٹا رام ان سے کوئی بدسلوکی نہ کرتے تھے۔ وہ صرف لڑکیوں کی آڑھت کرتے تھے۔ وہ مسلمان لڑکیاں سستے داموں خریدتے اور مہنگے داموں بیچ دیتے۔ نرخ یہ تھا۔

چودہ سے سولہ برس کی لڑکی سات سو پچاس سے ایک ہزار روپے تک۔

سولہ سے پچیس برس کی لڑکی تین سو سے پانچسو تک۔

میٹرک پاس لڑکی ڈیڑھ ہزار روپے۔

کالج کی پڑھی ہوئی لڑکی دو ہزار روپے۔

لڑکیوں کے بیان کے مطابق وہ اب تک سیکڑوں لڑکیوں کا بھگتان کر چکے تھے۔ ان میں مغویہ لڑکیوں میں ایک سانده کلاں کی لڑکی تھی جو مشرقی پنجاب میں بیاہی گئی تھی۔ اسے لالہ گھسیٹا رام نے خوب پیٹا تھا۔ اس کی عصمت دری کی تھی اور اس سے کہا تھا کہ وہ دو ہزار نوے سونا سانده کلاں کی عورتوں کو واپس کر کے آئے ہیں جب تک وہ اس کی قیمت وصول نہ کرلیں گے وہ اسی طرح مسلمان لڑکیاں خریدتے اور بیچتے رہیں گے۔ چھ ماہ بعد لالہ گھسیٹا رام باعزت بری ہو گئے۔ ان کی آڑھت کی دوکان پہلے سے بھی زیادہ چلتی ہے۔ حکام اعلیٰ ان کی عزت پہلے سے بھی زیادہ کرتے ہیں۔ ان کی حویلی کے باہر گورکھے پہرہ دیتے ہیں۔ اور کبھی کبھی آدھی رات کے وقت وہاں سے چیخوں کی صدا بلند ہوئی ہے جسے سنکر لوگ کہتے ہیں کہ پاکستان رو رہا ہے۔ کچھ لوگ سوچتے ہیں کہ ہندوستان رو رہا ہے اور کچھ لوگ کہتے ہیں کہ پاکستان رو رہا ہے نہ ہندوستان اس حویلی میں انسان رو رہا ہے اور یہ حویلی سرحد کے آر پار دونوں طرف کھڑی ہے۔

●